دنیا بھر کے محنت کشو ایک ہو جاؤ!

پاکستان تناظر

مجوزہ دستاویز نمبر 2

کانگریس 2016-17ء

فہرست

1۔عہدنو اور چرخِ کہن

2۔غلام ریاست، سامراجی عزائم

3۔دیوالیہ معیشت؟

4۔پاک چین اقتصادی راہداری اور چینی سامراج کا غلبہ

5۔سماجی انتشار

6۔سیاست کس عہد کی؟

7۔تحریک کا تناظر

1۔عہدِ نو اور چرخِ کہن

ہم ایک نئے عہد میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہ سرمایہ داری کے بدترین زوال اور بربادی کا عہد ہے۔ یہ جنگوں، خانہ جنگیوں، انقلابات اور ردِ انقلابات کا عہد ہے۔ ایک ایسا عہد جو اس سے پہلے انسانی تاریخ نے نہیں دیکھا۔ اس عہد کا ہر آنے والا دن سرمایہ داری کو کمزور تر کرتا چلا جائے گا اور انقلابی قوتوں کو آگے بڑھنے کے وسیع تر مواقع فراہم کرے گا۔

2008ء کے معاشی بحران کو دنیا بھر میں حکمرانوں اور ذرائع ابلاغ نے صرف ایک مالیاتی مسئلہ بنا کر پیش کیا اور تمام تر بورژوا تجزیہ نگار اس کے اثرات اور نتائج کو محدود کر کے پیش کرتے رہے۔ اس کے مقابلے میں سوویت یونین کے انہدام، دیوار برلن کے خاتمے یا پھر نائن الیون کے واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا۔ گو کہ سوویت یونین کا انہدام اور دیوار برلن کا خاتمہ بھی تاریخ کے غیر معمولی واقعات میں سے تھے اور انہوں نے پوری دنیا میں گہرے اثرات مرتب کیے۔ دنیا بھر میں بائیں بازو کی قوتوں اور مزدور تحریک کو پسپائی کا سامنا کرنا پڑا اور امریکی سامراج کا دنیا پر غلبہ پہلے کی نسبت کئی گنا زیادہ بڑھ گیا۔ طاقت کے اسی نشے میں بدمست امریکی سامراج نے افغانستان اور عراق میں جنگیں برپا کر دیں اور پورے خطوں کو غیر مستحکم کر دیا۔ لیکن 2008ء کا مالیاتی بحران ایک مختلف دور کا آغاز تھا جو امریکی سامراج کے زوال اور سرمایہ داری کے گہرے بحرانوں کا عہد ہے۔ یہ مالیاتی بحران تیزی سے ریاستوں کے بحران میں تبدیل ہوا اور ہم نے یورپ کی بہت سی ریاستوں کو دیوالیہ پن کے قریب جاتے ہوئے دیکھا جن میں یونان سرفہرست ہے۔ اسی دوران 2011ء کے عرب انقلابات نے پوری دنیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ تین سے چار دہائیوں پرانی آمریتیں چند دنوں میں ہوا میں معلق ہو گئیں اور عرب دنیا کے بدترین آمروں کو عوامی طاقت کے ذریعے اقتدار سے برطرف کر دیا گیا۔ ان انقلابات کی درست مارکسی قیادت نہ ہونے کے باعث یہ رد انقلابات اور خانہ جنگیوں میں زائل ہو گئے اور ابھی بھی مشرق وسطیٰ ان تاریخی واقعات کے اثرات سے باہر نہیں نکل سکا۔

2008ء میں شروع ہونے والا مالیاتی بحران اتنے سال گزر جانے کے باوجود ختم نہیں ہوا بلکہ اب مزید گہرا ہو گیا ہے اور خود بورژوا معیشت کے تجزیہ نگاروں کے مطابق عالمی معیشت 2008ء سے بھی بڑے مالیاتی بحران کی جانب تیزی سے گامزن ہے۔ درحقیقت جولائی 2016ء میں برطانیہ میں ہونے والے بریگزٹ ریفرنڈم کے بظاہر حیران کن نتائج کے بعد یہ بحران معیاری طور پر ایک نئے مرحلے کی جانب بڑھ چکا ہے جو پورے عالمی مالیاتی نظام کو زیادہ بڑے پیمانے پر تباہ کرنے کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اس وقت پوری عالمی معیشت لڑکھڑا رہی ہے اور ایک کے بعد دوسرے اشاریے گہری کھائی میں گرنے کی نوید سنا رہے ہیں۔ آئی ایم ایف کے اندازے کے مطابق عالمی تجارت اس سال صرف 1.7 فیصد کی شرح سے ترقی کرے گی جو گزشتہ پندرہ سالوں کی کم ترین سطح ہے۔ 2008ء میں ملنے والا چین اور نام نہاد ابھرتی معیشتوں کا سہارا بھی ختم ہو چکا ہے اور یہ معیشتیں جن سے پوری عالمی معیشت کو چلانے کی توقع کی جا رہی تھی خود بدترین بحرانوں میں گھر چکی ہیں۔ 2008ء کے بعد دنیا کے کچھ خطوں میں ہمیں بڑی تحریکیں یا انقلابی تحریکیں نظر آئیں جبکہ باقی دنیا ان کے اثرات پر بحث کر رہی تھی۔ عرب انقلابات نے مشرقِ وسطیٰ کے بڑے حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا لیکن سعودی عرب جیسا اہم ملک اور کئی دیگر خلیجی ممالک اس سے بڑی حد تک محفوظ رہے۔ اسی طرح یونان میں ابھرنے والی تحریک اور تاریخی واقعات کو باقی یورپ میں غور سے دیکھا جا رہا تھا اور اس سے اسباق حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اسی طرح نیویارک سے اٹھنے والی آکوپائی وال سٹریٹ کی تحریک اور روس میں پیوٹن کے خلاف ہونے والے احتجاج ایک نئے عہد کے آغاز کا اعلان تو تھے لیکن زیادہ بڑی سیاسی تبدیلیوں کا باعث نہیں بن سکے۔

لیکن آج دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں جہاں احتجاجی تحریکیں، بغاوتیں، وسیع پیمانے کی ہڑتالیں اور بڑی سیاسی تبدیلیوں کے آثار دکھائی نہ دیتے ہوں۔ جنوبی افریقہ میں اس وقت ایک بہت بڑی طلبہ تحریک موجود ہے جس نے پورے ملک کی یونیورسٹیوں کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ محنت کشوں کی بڑی ہڑتالیں اور احتجاجی مظاہرے پہلے سے موجود ہیں۔ افریقہ کے دیگر ممالک میں آمریتوں کے خلاف احتجاج جاری ہیں جن کی بہت کم خبریں منظر عام پر آتی ہیں۔ برکینا فاسو میں تھامس سنکارا کے انقلابی نظریات کے احیا اور حکمرانوں کے خلاف تحریک کے علاوہ کانگو، گیبون، برونڈی، زمبابوے، ایتھوپیا اور دیگر مختلف ممالک میں حکمرانوں کے خلاف وسیع

پیمانے کی احتجاجی تحریکیں موجود ہیں جن میں لاکھوں لوگ شامل ہیں جبکہ ریاستی جبر میں سینکڑوں افراد ہلاک اور ہزاروں زخمی ہو چکے ہیں۔ لاطینی امریکہ کے سب سے بڑے ملک برازیل میں ریاست شدید ترین بحران کا شکار ہے۔ معیشت گزشتہ 85 سالوں میں اپنی نچلی ترین سطح پر پہنچ چکی ہے جبکہ منتخب صدر ڈلما روزیف کو برطرف کر کے اس پر بدعنوانی کے مقدمات چلائے جا رہے ہیں۔ اسی دوران بغاوت کے بعد صدر بننے والے ٹیمر کے خلاف احتجاجی مظاہرے پورے ملک میں جاری ہیں۔ مہنگائی اور بیروزگاری کیخلاف ہونے والے بڑے احتجاجی مظاہرے اس کے علاوہ ہیں۔ اسی طرح ارجنٹائن میں نئے صدر کیخلاف احتجاجی تحریک اور ہڑتالیں جاری ہیں۔ چلی میں طلبہ تحریک زوروں پر ہے جبکہ میکسیکو سمیت لاطینی امریکہ کے تقریباً تمام ممالک احتجاجی تحریکوں کی لپیٹ میں ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ کے حالات پر تفصیلی بحث درکار ہے لیکن یہ واضح ہے کہ سرمایہ داری کے پاس اس مسئلے کا کوئی حل نہیں اور آنے والے دنوں میں یہاں زیادہ خونریزی اور بدامنی پھیلے گی اور عدم استحکام مزید بڑھے گا۔ اس دوران ترکی جو اس خونی دلدل سے بچا ہوا تھا اب اس میں دھنستا جا رہا ہے۔ ترکی کی معیشت شدید بحران کا شکار ہے اور اب وہ شام کی جنگ میں بھی براہ راست شریک ہے۔ اسی طرح سعودی عرب کی معیشت ہچکولے کھاتی ہوئی گہری کھائی کی جانب بڑھ رہی ہے۔ اس معاشی بحران کے اثرات پاکستان سمیت جنوبی ایشیا کے تمام ممالک پر پڑ رہے ہیں جہاں کے لاکھوں محنت کش یہاں مزدوری کرتے ہیں۔ آنے والے عرصے میں تیل کی قیمتوں میں بڑے پیمانے پر اضافے کے کوئی امکان نہیں جس کے باعث تیل کا بحران سعودی عرب اور تمام خلیجی ممالک کی معیشتیں ڈبونے کی جانب بڑھے گا جہاں پہلے ہی بے چینی اور عدم استحکام بڑھتا جا رہا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے بحران نے پہلی عالمی جنگ کے بعد مغربی سامراجوں کی بنائی ہوئی قومی ریاستوں کو بھی ہوا میں معلق کر دیا ہے اور بہت سی ریاستوں کا وجود عملاً ختم ہو چکا ہے اور وہ صرف کاغذوں اور نقشوں تک ہی محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ ان میں لیبیا، شام، عراق اور یمن شامل ہیں۔ یمن کے علاوہ دیگر کو صرف چند سال پہلے تک انتہائی مضبوط ریاستیں تصور کیا جاتا تھا۔ آنے والے دنوں میں دیگر ریاستیں بھی اسی قسم کی کیفیت کی جانب بڑھیں گی اور جہاں انقلابی اور ردانقلابی قوتوں کی لڑائی بڑھے گی وہاں مختلف رجعتی قوتوں کی آپسی لڑائیوں میں بھی عوام کے خون سے ہولی کھیلی جائے گی۔

امریکہ کے حالیہ صدارتی انتخابات سرمایہ داری کی اسی ناقابلِ علاج بیماری کا واضح اظہار ہیں جہاں دونوں امیدوار امریکی حکمران طبقے کے زوال اور گراوٹ کی بخوبی نمائندگی کر رہے ہیں۔ بہت عرصہ پہلے امریکی ادیب گورے وڈال نے ڈیموکریٹ اور ری پبلکن پارٹیوں کے متعلق کہا تھا کہ امریکہ میں ایک سیاسی پارٹی ہے جس کے دو دائیں بازو ہیں۔ حالیہ صدارتی انتخابات میں لاکھوں امریکی اپنے تجربے کے ذریعے اسی نتیجے پر پہنچ چکے ہیں اور دونوں پارٹیوں سے کوئی امید باقی نہیں رہی۔ اسی دوران برنی سینڈرز کے گرد ابھرنے والی ریڈیکل سماجی تبدیلی کی تحریک اور پھر سیاہ فام صدر ہونے کے باوجود سیاہ فاموں کی ملک گیر تحریک امریکہ کے بحران کی شدت کو واضح کر رہی ہے۔ آنے والے عرصے میں امریکی حکمران طبقہ وہاں کے محنت کشوں کو پہلے جیسا معیارِ زندگی اور روزگار کے مواقع کسی صورت بھی فراہم نہیں کر سکے گا بلکہ ان پر مزید معاشی حملے کرے گا جس کے نتیجے میں یہ تحریکیں زیادہ شدت کے ساتھ پھیلیں گی اور نوجوانوں اور محنت کشوں کی مزید پرتوں کو اپنے ساتھ جوڑتے ہوئے نئے سیاسی محاذوں کی جانب بڑھیں گی۔ امریکی معاشی بحران اور یہاں ابھرنے والی تحریکوں کے اثرات پوری دنیا پر مرتب ہوں گے۔

اسی طرح چین میں ہونے والی ہڑتالوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور ساتھ ہی چین کا معاشی بحران گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ پورے چین میں لوہے کی بڑی صنعتوں سمیت دیگر اداروں کو بند کیا جا رہا ہے جس کے باعث لاکھوں مزید محنت کش بیروزگار ہو رہے ہیں۔ یہ چین میں بڑے سماجی دھماکوں کی بنیاد رکھ رہا ہے جس کے باعث چین کے سماج پر نام نہاد کمیونسٹ پارٹی کی آمرانہ گرفت شدید خطرے میں ہے اور چین کی ریاست کے تمام تر جبر کے باوجود وہ ان تحریکوں کو ابھرنے سے نہیں روک سکے گی۔ مشرق بعید میں جنوبی کوریا سے لے کر تھائی لینڈ تک تمام ممالک عدم استحکام کا شکار ہیں اور بڑی احتجاجی تحریکوں کی لپیٹ میں ہیں۔

یورپ کے موجودہ حالات پر الگ سے تفصیلی بحث اور دستاویز کی ضرورت ہے۔ ہر آنے والا دن ایسے واقعات سے بھرپور ہوتا ہے جو یورپ کے معاشی اور سیاسی بحران کی گہرائی کو واضح کرتے ہیں۔ خود یورپی یونین شدید بحران کا شکار ہے اور اس کو بنانے والے خود اس کے مستقبل میں قائم رہنے کے بارے میں پر اعتماد نہیں ہیں۔ بریگزٹ ریفرنڈم نے پورے یورپ میں سیاسی اور معاشی زلزلے برپا کر دیے ہیں جن سے یورپی یونین کی بنیادیں اب تک لرز رہی ہیں اور اس کے انہدام کی پیش گوئیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ برطانوی پاؤنڈ گزشتہ 31 سال کی کم ترین سطح پر آ گیا ہے جبکہ

تجارتی حوالے سے یہ دنیا کی 154 کرنسیوں میں نچلی ترین سطح تک پہنچ چکا ہے۔ اکتوبر میں جرمنی کے سب سے بڑے بینک ڈیوٹشے بینک کے حصص میں ایک دن میں 9 فیصد کمی دیکھنے میں آئی جس کے بعد سے مسلسل اس کے دیوالیہ ہونے کی پیش گوئیاں کی جارہی ہیں۔ اس موقع پر سیاسی رد عمل سے بچنے کے لیے انجیلا مرکل کو اعلان کرنا پڑا کہ اگر یہ دیوالیہ ہوا تو اس بینک کو بیل آؤٹ نہیں کیا جائے گا۔ گو کہ خفیہ طریقوں سے امدادی کاروائیاں یقینی ہیں۔ اس دیوالیہ پن کو 2008ء میں لیہمن برادرز کے دیوالیہ ہونے سے مماثلت دی جارہی ہے۔ یعنی کہ اگر یہ بینک دیوالیہ ہوا تو یورپ کے تمام بڑے بینک دیوالیہ ہونے کی جانب بڑھیں گے۔ ان بینکوں کو پہلے ہی بیمار قرار دیا جارہا ہے۔ ایسے میں جرمنی سمیت تمام یورپی معیشتیں دیوالیہ ہونے کی جانب بڑھیں گی۔

یورپ میں پہلے ہی 2008ء کا بحران بڑی سیاسی تبدیلیوں کا باعث بن چکا ہے۔ یونان میں محنت کشوں کی روایت پاسوک کا خاتمہ اور سائریزا کا ابھار اور اس کی غداری پہلے ہی محنت کشوں کے لیے اہم نتائج مرتب کر چکی ہے۔ اب اسپین میں بحران کی کیفیت میں روایتی سوشلسٹ پارٹی کی غداری اور پوڈیموس کا ابھار نئی سیاسی صف بندی کا اعلان کر چکا ہے۔ برطانیہ میں بریگزٹ سے پہلے سکاٹ لینڈ کا ریفرنڈم نئی سیاسی صف بندی کا پیش خیمہ بنا تھا۔ بریگزٹ کے بعد سیاست میں لاکھوں افراد خصوصاً نوجوانوں کی دلچسپی میں مزید اضافہ ہوا ہے جس نے دائیں اور بائیں جانب نئی سیاسی صف بندیاں قائم کی ہیں۔ لیبر پارٹی میں پانچ لاکھ افراد کی ممبرشپ اور پارٹی کے تمام تر ممبران پارلیمنٹ کی مخالفت کے باوجود جیرمی کاربن کی لیبر پارٹی کے سربراہ کے طور پر انتخاب ایک نئے عہد کے آغاز کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ایسے میں حکمران ٹوری پارٹی بھی شدید بحران کا شکار ہے اور اس کے پاس موجودہ حالات سے نپٹنے کا کوئی حل نہیں۔ جہاں برطانیہ کی معیشت شدید بحران کا شکار ہے وہاں برطانوی ریاست بھی سکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ میں علیحدگی کی تحریکوں میں شدت آنے کے خطرے سے دوچار ہے۔ اسی طرح فرانس، بیلجیم اور مغربی یورپ کے دیگر ممالک بحرانوں اور تحریکوں کی لپیٹ میں ہیں۔ اس میں دسمبر میں اٹلی میں ہونے والا ریفرنڈم اہم اثرات مرتب کرے گا اور اٹلی سمیت پورے یورپ کی سیاست کو نیا رخ دے سکتا ہے۔ اٹلی کے بینک پہلے ہی بیمار بینکوں میں سرفہرست ہیں اور آنے والی سیاسی اور معاشی تبدیلیاں ان کی طبع نازک پر گراں گزر سکتی ہیں۔

مشرقی یورپ میں جہاں یوکرائن کی ریاست خانہ جنگی کی لپیٹ میں ہے وہاں سابقہ

یوگوسلاویہ کے ممالک میں قومی اور لسانی تعصّبات پر دوبارہ شدت پسند سیاست کا آغاز ہو چکا ہے۔ مقدونیہ کے چھوٹے سے ملک میں کرپشن کیخلاف ابھرنے والی عوامی تحریک، پولینڈ میں لاکھوں خواتین کا اپنے حقوق کے لیے احتجاج اور آسٹریا کے حالیہ انتخابات میں دائیں اور بائیں بازو کی سکہ بند پارٹیوں کی شکست اور نئی پارٹیوں کے ابھارنے صورتحال کو واضح کر دیا ہے۔ اب یورپ کے بورژوا تجزیہ نگار خود یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ سنٹر رائیٹ اور سنٹر لیفٹ پارٹیوں اور سیاست کا وقت ختم ہو چکا ہے اور انتہائی بائیں اور انتہائی دائیں بازو کی سیاست کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہ عمل یورپ کے مختلف ممالک میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ یونان میں سائریزا کے ساتھ گولڈن ڈان، برطانیہ میں جیرمی کوربن کے ساتھ یو کے آئی پی، فرانس میں مزدور دشمن قوانین کیخلاف ابھرنے والی تحریک کے ساتھ ساتھ انتہائی دائیں بازو کی میری لی پین کا ابھار اسی عمل کی مختلف شکلیں ہیں۔ ایسی صورتحال میں اگر یورپ میں مالیاتی بحران شدت اختیار کرتا ہے اور امریکہ اور چین کی معیشتوں کو اپنے ساتھ کھینچتا ہے تو یہ تمام بغاوتیں اور تحریکیں معیاری جست لگا کر زیادہ شدت اختیار کر سکتی ہیں اور پوری دنیا میں ہڑتالیں، احتجاجی تحریکیں اور نئی سیاسی قوتیں ہر جگہ اسٹیٹس کو کے بخیے ادھیڑنے کی جانب فیصلہ کن انداز میں آگے بڑھیں گی۔

بہت سے قنوطیت پسند ایسے بھی ہیں جو اتنی بڑی تبدیلیوں کو غیر اہم قرار دے رہے ہیں اور اسٹیٹس کو کے ازلی اور ابدی ہونے کے دعوے دار ہیں۔ مزید یہ کہ وہ پاکستان سمیت بہت سے ممالک کی مثالیں دے کر کہتے ہیں کہ یہاں تو کچھ ایسی بڑی تبدیلی نہیں آئی اور اسٹیٹس کو نہیں ٹوٹا۔ اس لیے پاکستان اس عہد سے ابھی کوسوں دور ہے۔ دوسرا ان کے مطابق یہ عہد یکسر انقلابی یا پھر یکسر رد انقلابی کی گردان میں وزن پر پورا نہیں اترتا اس لیے ان کے نزدیک اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور یہ پرانا والا عہد ہی ہے۔

مارکسی نقطہ نظر سے کوئی بھی عہد مکمل طور پر کبھی بھی انقلابی نہیں ہوتا اور نہ ہی کبھی مکمل طور رد انقلابی ہوسکتا ہے اور انسانی تاریخ کا ہر عہد ہی متضاد کردار کا حامل ہوتا ہے۔ جب 1917ء میں روس میں لینن اور ٹراٹسکی کی قیادت میں انسانی تاریخ کا عظیم سوشلسٹ انقلاب برپا ہوا تھا اس وقت بھی روس میں رد انقلاب کا خطرہ شدت سے منڈلا رہا تھا۔ اگر لینن اور ٹراٹسکی بالشویک پارٹی کی سربراہی کرتے ہوئے سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے اقتدار پر قبضہ نہ کرتے تو روس میں ایک بدترین فوجی آمریت کا واضح امکان موجود تھا جس نے تمام انقلابی قوتوں کو خون میں ڈبو دینا تھا۔

اسی طرح 1871ء میں پیرس کمیون کی قیادت کی جانب سے بینکوں پر قبضہ نہ کرنے اور دیگر اہم غلطیاں سرزد کرنے کے باعث اس شاندار انقلاب کو ردانقلابی قوتوں نے خون میں ڈبو دیا۔ دوسری جانب جس وقت ہٹلر جرمنی میں برسر اقتدار آ رہا تھا اس وقت اگر سوشل فاشزم کی سٹالنسٹ پالیسی کا انحراف کرتے ہوئے جرمنی کی کمیونسٹ پارٹی اور سوشلسٹ پارٹی متحد ہو کر فاشزم کا مقابلہ کرتی تو نہ صرف جرمنی میں ہٹلر کو پرامن طریقے سے شکست دے دی جاتی بلکہ پورے یورپ اور دنیا کی تاریخ آج مختلف ہوتی۔ اسی عرصے میں اسپین میں بھی ایسی ہی صورتحال دیکھنے کو ملی جب 1931ء سے 1936ء تک انقلاب کے بہت سے مواقع انقلابی قیادت نے زائل کر دیے اور نتیجتاً اسپین کے عوام کو فرانکو کی بدترین آمریت کو کئی دہائیوں تک بھگتنا پڑا۔ ایسی بہت سی دیگر مثالیں دی جا سکتی ہیں جب انقلابات موضوعی عنصر نہ ہونے یا قیادت کی غلط پالیسیوں کے باعث ردانقلاب کی بھینٹ چڑھ گئے۔ جبکہ بہت سی جگہوں پر انقلابی قیادتوں کی جرات اور دلیری سے نسبتاً ناموافق صورتحال میں بھی انقلابی سرکشیاں ہوئیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ سماج میں کوئی ایسی صورتحال کبھی بنے گی جب عہد یکسر انقلابی ہو جائے گا درحقیقت فرار کا رستہ ہے۔ کیونکہ نہ ایسی کبھی صورتحال بنے گی اور نہ ہی انقلاب کے عظیم مقصد کے لیے قربانیاں دینے کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس لیے اپنی موقع پرستی اور انقلاب کے مقصد کے لیے درکار کٹھن راستوں پر چلنے سے تھکاوٹ کے باعث ایسی مکارانہ گفتگو کی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ کسی ایک ملک یا خطے کی مثال بنا کر یہ کہنا کہ باقی دنیا میں خواہ عہد تبدیل ہو گیا ہو یا ہونا شروع ہو گیا ہو لیکن یہاں ابھی ایسا کچھ نہیں اور ابھی پرانا عہد ہی ہے اس لیے فکر کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسی فارمولے کو پھر ایک ملک کے مختلف حصوں اور پھر گلی محلے کی سطح تک بھی مضحکہ خیز انداز میں لاگو کیا جاتا ہے، کہ فلاں محلے میں مختلف عہد ہے اور یہاں مختلف۔

حقیقت یہ ہے کہ عالمی معیشت مختلف ممالک کی معیشتوں کا حاصل جمع نہیں بلکہ ایک کُل ہے۔ اور کسی ایک خطے میں ہونے والی تبدیلی پوری عالمی معیشت پر اثرات مرتب کرتی ہے۔ اور جب امریکہ، چین، جرمنی، فرانس اور برطانیہ جیسے ممالک کا ذکر ہو جو عالمی معیشت کے بنیادی ستون ہیں تو صورتحال مزید واضح ہو جاتی ہے۔ امریکہ اور برطانیہ کے سامراجی کردار سے حقارت کے باعث ان کی معیشتوں کے کردار اور دنیا پر اس کے اثرات کو کم تر کر کے پیش کرنا موقع پرستانہ جذباتیت تو ہو سکتی ہے لیکن مارکسی بنیادوں پر سائنسی تجزیہ بالکل بھی نہیں۔ پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک عالمی

مالیاتی سامراجی اداروں کے قرضوں تلے دبے ہونے کے علاوہ اور بہت سے ناطوں سے عالمی معیشت کے رحم وکرم پر ہیں۔ تیل کی قیمتوں میں کمی بیشی ہو یا ڈالر کی قدر میں اتار چڑھاؤ ان ممالک کی معیشتیں براہ راست متاثر ہوتی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا قطعاً مبالغہ آرائی نہیں ہوگی کہ اگر ان ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ معیشتوں کو چھینک آجائے تو ترقی پذیر ممالک کی معیشتوں کو بخار چڑھ جاتا ہے۔ یہی صورتحال سیاسی میدان میں بھی واضح ہے۔ امریکی صدارتی انتخابات کے متعلق تو برملا کہا جاتا ہے کہ اس کے اثرات پوری دنیا میں مرتب ہوتے ہیں۔ اور خاص کر اس دفعہ کے صدارتی انتخابات روایت سے ہٹ کر ہیں اور امریکی سرمایہ داری کی کھوکھلی حقیقت کو دنیا کے سامنے ننگا کر رہے ہیں۔ ایسے میں پاکستان یا دیگر ایسے ممالک اس سے کیسے بچ سکتے ہیں۔ مگر ایسا ضرور ہے کہ دنیا کے تمام ممالک پر ان تبدیلیوں کے ایک جیسے اثرات مرتب نہیں ہوتے اور وہاں موجود مخصوص صورتحال کے ساتھ ایک جدلیاتی تعلق میں آتے ہوئے ہی وہاں کا سماج حرکت کرتا ہے۔ کہیں پر یہ اثرات زیادہ شدت کے ساتھ اثر پذیر ہوتے ہیں اور کہیں کم شدت کے ساتھ۔ اسی لیے کئی ممالک میں تحریکیں زیادہ ایڈوانس مراحل میں داخل ہو چکی ہیں جبکہ کئی جگہوں پر ابتدائی مرحلے میں ہیں۔ لیکن ایک نئے عہد کے آغاز کا معنی یہ ہے کہ پوری دنیا ایک ایسے عمل کا حصہ بن چکی ہے جو پہلے کی نسبت مختلف ہے اور دنیا کے تمام حصوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔

لیکن اگر پاکستان کے میڈیا کی خبروں پر من وعن یقین کر لیا جائے اور حکومتی پالیسی کو دیکھا جائے تو ایسا نظر آتا ہے کہ دنیا میں کچھ زیادہ بڑی تبدیلی نہیں آئی۔ گزشتہ کئی سالوں سے بالخصوص 2008ء کے بعد سے پاکستان کی کوئی واضح خارجہ پالیسی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ٹی وی پر عالمی صورتحال کے حوالے سے ایک بھی پروگرام موجود نہیں۔ یہی فقدان اخباری کالموں میں نظر آتا ہے۔ اسی لیے ابھی تک کسی اخبار نے یہ سرخی نہیں نکالی اور نہ ہی کسی ٹی وی پر یہ بریکنگ نیوز چلی ہے کہ عہد تبدیل ہو چکا ہے۔ اسی لیے شاید بہت سے نام نہاد انقلابی اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکاری ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت دنیا بھر میں ہونے والے سینکڑوں ایسے واقعات سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ دنیا ایک نئے عہد میں داخل ہو چکی ہے۔ خواہ اسے کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی قنوطیت پسند یہ واویلا بھی کرتے ہیں کہ پاکستان، افغانستان اور دیگر بہت سے ملکوں میں انقلابی عہد نہیں ہے اور ایسی باتیں کرنے والے مہم جو ہیں جن کی گفتگو کے

دوران کان بند کر لینے چاہئیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یا تو کوئی عہد بالکل انقلابی ہوتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر تمام عہد ایک ہی جیسے ''غیر انقلابی'' عہد ہوتے ہیں۔ صرف بیسویں صدی پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالنے سے یہ عقدہ بھی حل ہو جاتا ہے جہاں ہمیں انتہائی مختلف قسم کے عہد نظر آتے ہیں۔ پہلی عالمی جنگ سے قبل دنیا ایک مختلف عہد میں تھی جبکہ جنگ کے دوران اور اس کے بعد ایک یکسر مختلف عہد دیکھنے میں ملتا ہے۔ خاص کر روس میں سوشلسٹ انقلاب کے بعد پوری دنیا ایک مختلف عہد میں داخل ہوتی نظر آتی ہے۔ اسی طرح 1929ء میں سرمایہ داری کے عالمی معاشی بحران نے دنیا کو ایک مختلف عہد میں دھکیل دیا۔ جبکہ دوسری عالمی جنگ کے بعد ایک بالکل مختلف عہد نظر آتا ہے۔ اس وقت بھی بہت سے نام نہاد ٹراٹسکائیٹ عہد کے کردار کو درست طور پر نہ سمجھ سکے جو سرمایہ داری کے طویل ترین عروج کا دور تھا جس میں سوشل ڈیموکریسی اور اصلاح پسندی کے نظریات کو مادی بنیادیں ملی اور حقیقی مارکسی قوتیں پوری دنیا میں محدود ہو گئیں۔ اسی لیے اس وقت محنت کش طبقے میں کام کے مختلف طریقے اپنانے ضروری تھے۔ ساٹھ اور ستر کی دہائی میں ایک دفعہ پھر پوری دنیا میں انقلابی تحریکیں ابھرتی نظر آتی ہیں جن میں فرانس میں ہونے والی 1968ء کی ہڑتال سر فہرست تھی۔ اسی طرح سوویت یونین کے انہدام اور دیوار برلن کے خاتمے کے بعد ایک مختلف عہد کا آغاز ہوا جو عالمی سطح پر سامراجی قوتوں کے ابھار اور مزدور تحریک کی پسپائی کا عہد تھا۔ ایک قنوطیت پسند تو یہی کہے گا کہ سرمایہ داری گزشتہ کئی سو سالوں سے موجود ہے اور بیسویں صدی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی دوسرا یہ کہ طبقاتی نظام تو ہزاروں سالوں سے موجود ہے اور ابھی تک چل رہا ہے اس لیے آپ کس تبدیلی کی بات کر رہے ہیں۔ لیکن اگر بغور جائزہ لیا جائے تو صرف بیسیوں صدی میں سرمایہ داری اہم ترین تبدیلیوں سے گزری ہے اور سیاست، معیشت اور سماج کے تمام حصوں پر ان تبدیلیوں نے اہم اثرات مرتب کیے ہیں۔ اگر مارکسی ان تبدیلیوں اور ان کے اثرات کا سائنسی طریقے سے جائزہ نہیں لیں گے تو وہ نہ ہی سماج کو درست طور پر جان پائیں گے اور نہ ہی اس کو تبدیل کر سکیں گے۔

اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ کوئی بڑا واقعہ یکدم عہد کو تبدیل کر دیتا ہے اور تاریخ ایسے واقعات کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ اس لیے بیوقوفانہ انداز میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بڑے واقعات کا انتظار کیا جاتا رہے تاکہ وہ عہد کو تبدیل کر دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سماج میں جاری تبدیلی کا سالماتی عمل کسی وقفے کے بغیر مسلسل جاری ہے اور ہر وقت سماج اور پورے نظام کو تبدیل کر رہا ہے لیکن ایک

مخصوص وقت میں مقدار معیار میں تبدیل ہوتی ہے جس کے باعث پورا سماج ایک ہلچل کا شکار ہوجاتا ہے۔ ایسے میں سماج میں ہونے والے بڑے واقعات کے ذریعے ان تبدیلیوں کو جانچا اور پرکھا جاسکتا ہے اور ان کا درست تجزیہ کرتے ہوئے سماج کی تبدیلی کی کوشش کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ اسی لیے بیسویں صدی کے ان تمام عہدوں میں مارکسی قوتوں کے لیے درست تناظر تخلیق، کام کے طریقہ کار کا تعین اور مارکسی قوتوں کی تعمیر کے لیے سب سے بنیادی شرط یہی تھی کہ عہد کے کردار کا درست تعین کیا جائے۔ اگر ان تمام عہدوں کو ایک ہی طرز سے پرکھا جائے اور ایک آفاقی تناظر اور کام کا طریقہ کار بنا کر سب جگہ مسلط کیا جائے تو نہ صرف یہ انتہائی غیر مارکسی اور غیر سائنسی طریقہ کار ہوگا بلکہ اس کے ذریعے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھا جاسکتا۔ ایسی فاش غلطیاں ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں۔

جب یہاں 1968ء میں ایوب آمریت کے خلاف ایک انقلابی تحریک چل رہی تھی اس وقت بہت سے نام نہاد مارکسی دانشور اسے امریکی سی آئی اے کی ایک سازش قرار دے کر ایوب آمریت کو مضبوط کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس تحریک کا آغاز بھی معاشی محاذ پر مختلف چھوٹی بڑی ہڑتالوں اور احتجاجی مظاہروں سے ہوا تھا جو وقت کے ساتھ پھیلتے چلے گئے۔ جب کمیونسٹ پارٹیاں اس کا درست ادراک نہ کرسکیں اور اسے قیادت نہ فراہم کرسکیں تو معاشی محاذوں پر جاری اس تحریک نے سیاسی اظہار کے لیے ایک نئی پارٹی کو ذریعہ بنالیا جو بہت کم وقت میں ملک کی سب سے بڑی پارٹی بن گئی۔ عرب انقلاب کے دوران بھی ایسا ہی دیکھنے میں آیا جب لاکھوں افراد کی تحریک کو امریکی سازش قرار دیا جارہا تھا اور سماج میں ہونے والی اتنی بڑی تبدیلی کو تسلیم ہی نہیں کیا جارہا تھا۔

مارکسی بنیادوں پر عہد کے کردار کا درست تعین ہڑتالوں اور احتجاجی مظاہروں کے ساتھ ساتھ سیاسی پارٹیوں کے کردار اور مستقبل کو بھی سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ مزدور تحریک کی عمومی پسپائی اور سامراج کے تسلط میں اضافے کے عہد میں ہڑتالوں کا مستقبل اور کردار مختلف ہوگا۔ اور اگر کوئی بڑی ہڑتال ہوتی بھی ہے تو اس کے پھیلنے کے امکانات محدود ہوتے ہیں۔ 80ء کی دہائی میں برطانیہ میں کان کنوں کی ہڑتال اور امریکہ میں ائیر ٹریفک کنٹرولرز کی ہڑتال ایسی ہی مثالیں ہیں۔ جبکہ ایک ایسے عہد میں جب عمومی طور پر طبقاتی کشمکش کند ہونے کی بجائے شدت اختیار کرنے کی جانب بڑھ رہی ہے اس عہد میں ہڑتالوں اور احتجاجی مظاہروں کا کردار یکسر مختلف ہوتا ہے۔ ایسے میں کوئی ایک چھوٹا سا احتجاج ایسی چنگاری بن جاتا ہے جو پورے سماج میں آگ لگا دیتا ہے۔

تیونس کے چھوٹے سے قصبے میں بوعزیزی کا خودسوز احتجاج ایسی ہی ایک چنگاری تھا۔

اسی کے ساتھ ساتھ سرمایہ داری کی تاریخ کے مطالعے سے جہاں سماج کی حرکت کے عمومی قوانین اخذ کیے جاسکتے ہیں وہاں کسی بھی حتمی اور آفاقی فارمولے کو گھڑنا خود مارکسزم کی نفی ہے۔ بہت سے نام نہاد دانشور ایسے فارمولے نہ صرف گھڑ لیتے ہیں بلکہ اپنے تمام تناظر اور جدوجہد کو اسی کے تابع کر لیتے ہیں۔ جیسے یہ کہنا کہ سرمایہ داری کے معاشی زوال کے عرصے میں بڑی تحریکیں ابھرتی ہیں یا یہ کہ عروج کے عہد میں بڑی تحریکیں ابھرتی ہیں۔ سرمایہ داری کی تاریخ میں ہمیں دونوں قسم کی صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسا ہی ایک اور اہم مسئلہ تمثیلی استدلال (Analogy) کا ہے۔ جیسے یہ کہنا کہ یہ دور فلاں دور سے مماثلت رکھتا ہے اور اس لیے اب ویسا ہی سب کچھ ہوگا جیسا اس وقت ہوا تھا۔ جیسا کہ پہلی عالمی جنگ کے آغاز کے سو سال مکمل ہونے پر بہت سے تجزیہ نگار آج کی دنیا کی صورتحال کی مماثلت اسی دور سے بنا رہے تھے اور اس مفروضے کے لیے مختلف جگہوں سے دلائل اکٹھے کر رہے تھے۔ ایسا طرز فکر بالکل غیر سائنسی اور طفلانہ ہے۔

تاریخ کے مطالعے کا مقصد اس سے اہم اسباق اور نتائج اخذ کرنا ہوتا ہے لیکن بالکل ہو بہو ویسی ہی صورتحال کی توقع کرنا اور پھر بالکل ویسا ہی طریقہ کار اپنانا جیسا ماضی میں کسی اہم تاریخی فرد نے اپنایا ہو قابلِ تضحیک اور توہم پرستانہ ہے۔ جہاں ماضی سے ملتے جلتے بہت سے واقعات اور معروضی کیفیات نظر آتی ہیں وہاں وہ اس سے مختلف بھی ہوتی ہیں۔ اس لیے ان میں ایک جیسے اور اس سے مختلف دونوں پہلوؤں کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہوئے ہی ہم درست نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ بعض افراد ماضی میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ وہ موجود کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں اور ماضی کو موجود پر مسلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسا ہی عالمی ادب کے مشہور کردار ڈان کیخوٹے نے کیا تھا۔ ماضی کا ایک ایسا عہد جو ختم ہو چکا تھا اس کی روایات اور اخلاقیات اس نے موجودہ عہد پر انتہائی سنجیدگی سے مسلط کرنے کی کوشش کی اور پوری دنیا کے لیے مذاق بن گیا۔ ماضی کے موجود کے ساتھ تضاد کو سمجھنے کے لیے اس ناول کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ ایسے ڈان کیخوٹے ہمیں آج بھی نظر آتے ہیں۔ نام نہاد بائیں بازو کے حلقوں میں بھی ان کی کمی نہیں۔ کوئی بھٹو جیسا لباس پہن کر اور اندازِ تقریر اپنا کر بھٹو بننا چاہتا ہے تو کوئی لینن کی طرح داڑھی بنا کر لینن بننا چاہتا ہے۔

عہد کی تبدیلی کا ایک المیہ یہ بھی ہوتا ہے کہ عمومی عوامی شعور اس تبدیلی کو فوری طور پر قبول نہیں کرتا۔ عوامی شعور عمومی طور پر قدامت پسند اور سہل پسند ہوتا ہے اور ماضی کی طرز فکر، سماجی ڈھانچے

اور طریقوں کے ساتھ چمٹا رہنا چاہتا ہے۔ لیکن دوسری جانب سماجی سائنس کا ادراک رکھنے والوں کا فریضہ بنتا ہے کہ وہ اس عوامی شعور کے پیچھے چلنے کی بجائے سطح سے نیچے رونما ہونے والی تبدیلیوں پر غور کریں اور سماج پر ہونے والے اس کے اثرات سے لوگوں کو آگاہ کریں۔ بالکل ایسے ہی جیسے ارضیات کی سائنس کے ماہرین کرتے ہیں۔ کوئی بھی عام شخص نہیں بتا سکتا کہ کہاں زلزلہ آ سکتا ہے اور کہاں نہیں۔ اور یہ کہ زلزلے کی شدت کہاں زیادہ ہو گی اور کہاں کم۔ لیکن ارضیات کے سائنسدان اپنے سائنسی علم اور مشاہدے کی بنیاد پر زلزلے کی پیشین گوئیاں کر سکتے ہیں۔ گو کہ وہ بالکل درست وقت اور جگہ بتانے سے قاصر ہیں لیکن عمومی رائے سائنسی یقین کے ساتھ دے سکتے ہیں۔ جبکہ عام لوگوں کو زلزلے کا پتہ اسی وقت چلے گا جب وہ آئے گا اور آبادی کو تہہ و بالا کر دے گا۔ ایسی ہی کیفیت سماجی سائنس کی بھی ہے۔ اس لیے مارکسی تناظر انقلاب کی جدوجہد میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر بڑے واقعات سے خود مارکسی سائنس سمجھنے والے حیران رہ جائیں تو یہ ان کی شکست ہو گی۔ ہمیں واقعات کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے ان کی پیش بندی کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب بڑی تبدیلیاں وقوع پذیر نہیں ہو رہی ہوتیں اور ایک مخصوص عہد لمبے عرصے کی طوالت اختیار کر لیتا ہے تو ایک مخصوص تناظر اور کام کا طریقہ کار روٹین کا حصہ بن جاتا ہے۔ اسی تناظر کو بار بار دہرا کر تقریباً حفظ کر لیا جاتا ہے اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس کو ازلی اور ابدی تصور کرنے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن جب عہد کروٹ لیتا ہے، غیر معمولی تبدیلیاں وقوع پذیر ہونی شروع ہوتی ہیں اور پرانی روٹین سیاست، معیشت اور دیگر شعبوں میں ٹوٹتی ہے تو سب سے پہلا ردعمل یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ اس صورتحال پر یقین ہی نہیں کیا جاتا۔ اور اس کو معمول سے ایک وقتی انحراف کہہ کر رد کیا جاتا ہے۔ لیکن جب یہ غیر معمولی واقعات ایک نیا معمول اختیار کر لیتے ہیں تو صورتحال نئے تناظر اور طریقہ کار کا مطالبہ کرتی ہے۔ ایسے میں سماجی سائنس کے عالم کہلانے والوں کے لیے مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ نئی صورتحال کا تجزیہ اور تناظر بنانے کے لیے درست سائنسی علم پر گرفت درکار ہوتی ہے جو ہمارے عہد میں مارکسزم ہے۔ ماضی کے عہد میں ایک بنے بنائے تناظر کو کامیابی سے رٹ کر لوگوں تک پہنچانا اور انہیں اس پر قائل کرنا یقیناً ایک اہم پیش رفت ہوتی ہے۔ لیکن اس بنیاد پر دانشوری کے مطلق العنان تخت پر براجمان ہو جانا یقیناً ایک حماقت ہے۔ ایسا بہت مرتبہ دیکھنے میں آیا ہے۔

تبدیل شدہ صورتحال کا درست تجزیہ کرنے کے لیے بورژوا اخبارات و رسائل اور تمام تجزیے

ناکافی ہوتے ہیں۔اس کے لیے مارکسی فلسفے،معیشت اور تاریخی مادیت جیسے بنیادی اجزا پر مکمل گرفت درکار ہوتی ہے۔اسی بنیاد پر ایسی تبدیل شدہ کیفیت کا درست مارکسی تناظر تخلیق کیا جا سکتا ہے۔اس تمام کے باوجود کوئی بھی تناظر کبھی بھی حتمی اور آخری نہیں ہوتا بلکہ اس میں مسلسل اضافہ اور بہتری جاری رہتی ہے جو کسی ایک شخص کی مرہون منت نہیں ہوتی بلکہ ایک اجتماعی کاوش ہوتی ہے۔اس میں جتنے زیادہ لوگ ایک منظّم انداز میں شریک ہوں اور اپنا حصہ ڈالیں اس میں اتنا ہی نکھار آتا جائے گا اور وہ سماج کی تبدیلی کی جدوجہد کے لیے درست راہ متعین کرتا چلا جائے گا۔

لیکن اس تمام عمل کا حصہ صرف تازہ دم اور رجائیت پسند ذہن ہی ہو سکتے ہیں۔تھکاوٹ زدہ اور فارمولوں سے اٹے ہوئے بوسیدہ ذہن اس تخلیق کے عمل میں رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں۔ایسے ذہن جن میں ماضی کے فارمولے عقائد کی طرح ایسے لٹکے ہوں جیسے ویران مکانوں میں مکڑی کے جالے لٹکے ہوتے ہیں وہ صرف مایوسی ہی دیکھتے ہیں۔مارکس نے ایسے لوگوں کو یوٹوپیائی کہا تھا جو ''غربت میں صرف غربت دیکھتے ہیں، اس غربت کے انقلابی، تخریبی پہلوؤں کو دیکھے بغیر جو پرانے سماج کو اکھاڑ پھینکے گی۔'' (کارل مارکس، فلسفے کی غربت)

ایسے ہی بہت سے نام نہاد انقلابی کسی تحریک کی وقتی پسپائی، شکست یا قیادت کی غداری کو حتمی اور فیصلہ کن تسلیم کر لیتے ہیں۔یہ دیکھے بغیر کے اس نے سماج اور محنت کش طبقے کے شعور پر ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں جو پہلے سے بڑی تحریکوں اور انقلابات کا باعث بنیں گے۔ایسے ہی قنوطیت پسند عرب انقلابات کے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچنے پر مایوسی کا شکار ہیں۔جبکہ یہ نہیں دیکھتے کہ سعودی عرب اور ترکی جیسے کلیدی ممالک اس سے متاثر ہو رہے ہیں اور آنے والے عرصے میں زیادہ بڑی تبدیلی کے بیج پنپ رہے ہیں۔اس کے ساتھ ہی پچھلے عہد میں ہونے والی ہڑتالوں اور احتجاجی تحریکوں کو مثال بنا کر موجود عہد پر مسلط کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کچھ بھی نہیں بدل سکتا اور یہ سب ایسے ہی چلتا رہے گا۔سیاسی پارٹیوں اور محنت کشوں کی روایتوں کو بھی حتمی اور لافانی تسلیم کر لیا جاتا ہے اور تمام تر کاوشوں کو اسی دیوتا کی بھینٹ چڑھانے کا عقیدہ راسخ ہوتا چلا جاتا ہے۔گو کہ یہ حقیقت ہے کہ یہ پارٹیاں اور ریاستیں ہمیشہ سے نہیں تھیں بلکہ صرف چند دہائیاں قبل ہی وجود میں آئی تھیں۔اور ان میں دوبارہ بڑی تبدیلیاں نہ صرف ممکن ہیں بلکہ تیزی سے وقوع پذیر ہو رہی ہیں۔عرب انقلابات ہوں یا یونان میں سائریزا یا امریکہ میں برنی سینڈرز کے گرد بننے والی تحریکوں کی پسپائی۔اسی لئے عہد کے عمومی کردار کو سمجھنے ہمارا اہم فریضہ ہے۔اور پھر اس تخریب میں بھی تعمیر

کی ایک ترکیب پوشیدہ ہے۔ سوال اس کا ادراک حاصل کر کے اس کو اپنے لیے استعمال کرنے کا ہے۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگ کے بعد جتنی بڑی تباہی ہوئی تھی اس سے پہلے اور بعد کبھی نہیں ہوئی۔ لیکن سرمایہ داری کی برپا کردہ انہی جنگوں اور تباہی کی کوکھ سے روس اور چین سمیت بہت سے انقلابات نے جنم لیا تھا۔ مشرقِ وسطیٰ میں جاری خانہ جنگی یا آنے والے عرصے میں ہونے والے ایسے واقعات کی شدید ترین مذمت کے ساتھ ساتھ ان کیخلاف مارکسی سائنس کے نقطہ نظر سے تیاری کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ سائنس ہمیں مایوسی نہیں بلکہ رجائیت کا پیغام دیتی ہے۔

آج کی حقیقت یہ ہے کہ دنیا ایک ایسے عہد میں داخل ہو چکی ہے جہاں سرمایہ داری کے بنائے ہوئے تمام ادارے اور نظریئے غیر مستحکم ہو کر ٹوٹ رہے ہیں۔ دنیا میں ہونے والے بڑے واقعات نے کروڑوں افراد کے شعور پر کاری ضربیں لگائی ہیں اور وہ نئی صورتحال سے ہم آہنگ ہوتے جا رہے ہیں۔ اس میں ہراول کردار نوجوانوں کا ہے جنہوں نے شعور ہی اس نئے عہد میں حاصل کیا ہے۔ ایک ایسا عہد جو ان کے معیارِ زندگی کو مسلسل گراتا چلا جا رہا ہے اور انہیں روزگار سمیت کوئی بھی سہولت دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ بڑی عمر کے بھی بہت سے لوگ اس حقیقت سے نبرد آزما ہیں اور نئے عہد اور اس کے نئے معمول سے عہدہ برا ہونے کی کشمکش میں ہیں۔ لیکن ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو اس تبدیلی کو تسلیم کرنے سے یکسر انکاری ہیں۔ ان کے نزدیک لوگ پاگل ہو گئے ہیں اور ایک لمبے عرصے کی بنی ہوئی روایتوں اور رسوم کو ماننے سے انکار کر رہے ہیں۔ اتنی بڑی بڑی سیاسی روایتوں کا احترام نہیں کر رہے اور ریاستوں، مالیاتی اداروں اور سامراجی قوتوں کے آفاقی قوانین سے روگردانی کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ سب کچھ وقتی روگردانی ہے اور بہت جلد ان لوگوں کو اس روگردانی کی سزا ملے گی اور تمام تر ریاستی، مالیاتی، معاشی اور سیاسی ڈھانچے دوبارہ اپنی جگہ پر واپس ہو جائیں گے۔ یہ خام خیالی ہے اور یہ لوگ احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔ وقت بدل چکا ہے اور ماضی کو روندتے ہوئے مستقبل کی جانب رواں دواں ہے۔ ایسا مستقبل جس میں ماضی کے طریقوں اور تناظر کی گنجائش نہیں۔ یہ آنے والا کل انہی لوگوں کو خوش آمدید کہے گا جو اس کے استقبال کی پوری قوت کے ساتھ تیاری کریں گے۔ ماضی کو عقل پر اوڑھنے والوں اور اسی تاریکی کو مستقل ماننے والوں کی جگہ صرف تاریخ کے کوڑے دان میں ہے۔ مستقبل کو پوری گرمجوشی کے ساتھ بغل گیر کرنے والے ہی سرخ سویرے کو روشن کریں گے۔

2۔غلام ریاست، سامراجی عزائم

پاکستان کا جنم برطانوی سامراج کا ایک تاریخی جرم تھا۔ جب ہندوستان کے زندہ سماج کو چیر کر خونی بٹوارہ کیا گیا اسی وقت یہ واضح تھا کہ اس نومولود ریاست کو سامراجی طاقتیں اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کریں گی۔ یہاں کا حکمران طبقہ کسی انقلاب کے ذریعے برسر اقتدار نہیں آیا تھا بلکہ برطانوی آقاؤں کی گماشتگی اور کاسہ لیسی نے انہیں حکمرانی عطا کی تھی۔ برطانوی آقاؤں کے بعد انہیں امریکی سامراج میں اطاعت گزاری کے لیے آقا دستیاب ہو گئے اور بخوشی غلامی کا طوق گلے میں ڈال لیا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ شکنجہ سخت ہوتا گیا اور نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ خود حکمرانوں کو اب اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اسی لیے امریکی آقاؤں کے ساتھ ساتھ اب دوسرے سامراجی آقا بھی دستیاب ہیں اور ان کی اطاعت گزاری کی مشقیں جاری ہیں۔

آج عالمی صورتحال کا اہم ترین خاصہ امریکی سامراج کا خصی پن ہے۔ 2008ء کے مالیاتی بحران نے امریکہ کی سامراجی طاقت کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ عراق اور افغانستان کی نہ ختم ہونے والی جنگوں کا بوجھ اور مالیاتی بحران کے باعث امریکی سامراج کی کمزوری پوری دنیا میں واضح ہو گئی ہے۔ مارکسسٹوں نے اس وقت بھی واضح طور پر لکھا تھا جب امریکہ افغانستان پر حملہ آور ہو رہا تھا کہ کابل میں داخل ہونا تو آسان ہے لیکن وہاں قبضہ برقرار رکھنا اور وہاں سے پورے افغانستان پر حکومت کرنا انتہائی کٹھن اور دشوار گزار مرحلہ ہے۔ یہ ملک امریکی سامراج کے لیے دلدل ثابت ہوا۔ اسی طرح عراق کو بھی تاراج کرنے کے بعد وہاں اپنی کٹھ پتلی حکومت اور نام نہاد پارلیمنٹ کو مستحکم بنیادیں فراہم کرنے میں امریکی سامراج ناکام رہا۔ عرب انقلابات نے امریکہ کا رہا سہا بھرم بھی پاش پاش کر دیا۔ اپنے گماشتوں کو ان انقلابات کے غیض و غضب سے بچانے میں ناکامی نے امریکہ کے قریب ترین حلیفوں کا اپنے آقا پر اعتماد متزلزل کر دیا۔ حسنی مبارک کا حشر دیکھ کر سعودی عرب سمیت مشرقِ وسطیٰ کے تمام مطلق العنان حکمرانوں کے پیروں تلے زمین کھسک

گئی اور وہ اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ پیر مارنے لگے۔اس دوران سامراجی عزائم کی تکمیل کے لیے لیبیا میں سامراجی جارحیت کی ضرورت پیش آئی تو امریکہ نے کنارہ کشی اختیار کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح امریکہ سعودی عرب اور دیگر اتحادیوں کے پرزور اصرار کے باوجود شام میں فوجیں نہیں اتار سکا کیونکہ اسے عراق اور افغانستان کی جنگوں کا تجربہ تھا جس کے مطابق واضح تھا کہ یہ ایک ایسی خونی دلدل ہے جہاں ایک دفعہ دھنس گئے تو باہر نکلنا مشکل ہے۔اسی لیے شام میں مختلف بنیاد پرست قوتوں کو پراکسی بنا کر ان کے ذریعے اپنے سامراجی عزائم کی تکمیل کی کوشش کی گئی۔انہی پراکسیوں میں القاعدہ بھی شامل تھی جس سے پہلے جنگ کی جارہی تھی۔ایسا ہی کچھ یوکرائن کی خانہ جنگی میں دیکھنے میں آیا جہاں روس نے باآسانی کریمیا کو روس کا حصہ بنالیا اور یورپی طاقتیں اور امریکی سامراج اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔اس پر عائد کی جانے والی معاشی پابندیوں کو پیوٹن نے ہوا میں اڑادیا۔جنوبی چائنہ سمندر میں جاپان کے ذریعے چین کو دھمکانے کی کوششیں بھی کارگر نہیں ہوسکیں اور بحرالکاہل میں بھی چین اپنا اثر ورسوخ بڑھاتا چلا جارہا ہے۔

معاشی بحران کے باعث امریکہ کو اپنے دفاعی بجٹ میں بھی کمی کرنی پڑی اور امریکی عوام کے علاج، تعلیم اور دیگر بنیادی سہولتوں میں کٹوتیاں لگانے کے باعث ان سامراجی جنگوں کے خلاف عوامی ردعمل زیادہ شدت اختیار کرتا چلا گیا اور حکمرانوں کو معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنا پڑا۔گوکہ اسلامی بنیاد پرستی کو ابھی بھی اس کے حقیقی قد سے بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے اور اسے محنت کش عوام کو خوفزدہ کرنے اور دیوہیکل دفاعی بجٹ کی بنیاد بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ان سامراجی جنگوں کو جاری رکھنے اور اسلحہ ساز فیکٹریوں کے منافعوں کی شرح میں مسلسل اضافے کو یورپ اور امریکہ میں ہونے والے دہشت گردی کے واقعات نے بھی سہارا فراہم کیا اور عوامی رائے عامہ کو جنگوں کے لیے استوار کرنے کی مہم میں مدد فراہم کی۔لیکن اس کے باوجود امریکی سامراج پہلے جیسی رعونت کے ساتھ دنیا پر حکم نہیں چلا سکتا اور عالمی تعلقات پر اس کی گرفت مسلسل کمزور ہورہی ہے۔

اس صورتحال کا پاکستان کے حکمران طبقات نے بھی بخوبی فائدہ اٹھایا۔2001ء میں جب امریکہ افغانستان پر حملہ آور ہوا تھا اس وقت پاکستان کی معیشت دیوالیہ پن کے دہانے پر تھی۔لیکن اس جنگ کے دوران امریکہ نے مختلف حوالوں سے پاکستانی ریاست کو اربوں ڈالر کی امداد دی تاکہ اس گماشتہ ریاست کو افغانستان میں اپنے سامراجی عزائم کی تکمیل کے لیے استعمال کیا جا

سکے۔اس دوران صرف کولیشن سپورٹ فنڈ اور دیگر دفاعی ضروریات کے لیے تیس ارب ڈالر سے زیادہ یہاں پر آئے جسے یہاں کے حکمرانوں نے جی بھر کے لوٹا۔آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے نسبتاً نرم شرائط پر دیے جانے والے قرضے اس کے علاوہ ہیں۔اس دوران پاکستانی ریاست نے جہاں دہشت گردی کے خلاف مبینہ جنگ میں امریکہ کو مدد فراہم کی وہاں اس جنگ کو ایک دہائی سے زیادہ عرصے تک جاری رکھنے کے لیے دہشت گردوں کی سپلائی میں بھی کمی نہیں آنے دی۔ امریکی سی آئی اے کی پشت پناہی سے بننے والی ان دہشت گرد تنظیموں کو پاکستانی ریاست اپنے تزویراتی اثاثے قرار دے چکی ہے۔اس لیے ان اثاثوں کو اربوں ڈالر بٹورنے اور سامراجی جنگ جاری رکھنے کے لیے بخوبی استعمال کیا گیا۔عرب انقلابات کے بعد پورا مشرقِ وسطیٰ جنگوں اور خانہ جنگیوں کی لپیٹ میں ہے اور اسلامی بنیاد پرست پیدا کرنے میں خود کفیل ہو چکا ہے لیکن اس سے پہلے ایک دہائی کے عرصے تک پاکستانی ریاست نے دہشت گردی کے خلاف اس سامراجی جنگ میں امریکہ کو دشمنوں کی کمی نہیں آنے دی جن کو تباہ کرنے کے لیے سینکڑوں ڈرون سمیت اسلحے کے دیگر سودے جاری رہے۔اس عرصے میں اسامہ بن لادن کا کردار ایک ضرورت بن گیا تھا جس کا بہت بڑا ہوا بنا کر مغربی ممالک کے عوام پر مسلط کیا گیا۔لیکن عرب انقلابات نے مذہبی جنون کے اس تمام تر ناٹک کو رد کر کے طبقاتی کشمکش کو دوبارہ ایجنڈے پر رکھا جس کے بعد اس کردار کی ضرورت ختم ہو گئی اور اسے صفحۂ ہستی سے غائب کر دیا گیا۔اسی طرح افغانستان سے امریکی فوجوں کے انخلا کے بعد پاکستانی ریاست کی گماشتگی کی ضرورت امریکہ کے لیے ختم ہوتی گئی اور وہاں سے آنے والی رقم بھی بند ہونے لگی۔پاکستانی ریاست نے آخری وقت تک امریکی افواج کے انخلا کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی کیونکہ ان کی موجودگی ہی ان کے لیے ڈالروں کی آمد کے سلسلے کو جاری رکھنے کی ضمانت تھی۔اس کے لیے بار بار استدعا کی گئی کہ ابھی دہشت گردی کا مسئلہ پوری طرح ختم نہیں ہوا اور یہ قوتیں ابھی بھی بہت زیادہ طاقتور ہیں اور ان کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے لیکن امریکہ کی اس خطے سے دلچسپی ختم ہو چکی تھی اور معاشی بحران کے باعث وہ اس جنگ کو جاری رکھنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔یہاں سے جانے کے بعد امریکی سامراج نے پاکستان کے ضرورت سے زیادہ بڑھے ہوئے قد کو اپنی اصلی جگہ پر لانے کی کوشش کی اور افغانستان میں پاکستان کے اثر و رسوخ کا مقابلہ کرنے کے لیے ہندوستان کی پشت پناہی کا آغاز کیا۔

واضح رہے کہ سرد جنگ کے دوران ہندوستان کے حکمرانوں کا قبلہ ماسکو کی جانب تھا۔ اور پاکستانی ریاست کو خطے میں امریکی گماشتے کی حیثیت سے دیکھا جاتا تھا دوسری جانب چین کے ساتھ تضادات ہونے کے باعث سوویت یونین کے ساتھ ہی ہندوستان کا فطری اتحاد بنتا تھا۔ سٹالنسٹ سوویت یونین میں بھی ہندوستان کی ریاستی سرمایہ داری کو ترقی پسند تصور کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ خطے میں چین اور امریکہ کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہندوستان کا ساتھ دیا جاتا تھا۔ اس دوران افغانستان بھی سوویت یونین کے زیر اثر ہونے کے باعث ہندوستان سے قریبی تعلقات قائم رکھے ہوئے تھا۔ لیکن سوویت یونین کے انہدام کے بعد صورتحال یکسر تبدیل ہوگئی۔ نجیب کی حکومت کے خاتمے کے بعد افغانستان میں پاکستانی ریاست نے امریکی پشت پناہی سے اپنے سامراجی عزائم کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا جس کے نتیجے میں افغانستان کو ملاؤں کے ہاتھوں تاراج کیا گیا۔ طالبان کی حکومت بنوانے کا جرم بھی پاکستانی ریاست نے امریکی آشیر باد سے ہی کیا۔

دوسری جانب سوویت یونین کے انہدام کے بعد ہندوستان میں بھی ریاستی سرمایہ داری کا تجربہ ناکامی سے دوچار ہوا اور ہندوستان کی ریاست کو نیولبرل پالیسیوں کی جانب گامزن ہونا پڑا۔ اسی دوران آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے بھی رجوع کیا گیا۔ 1991ء میں من موہن سنگھ کے ہندوستان کے وزیر خزانہ بننے سے لے کر 2014ء میں اس کی دس سالہ حکومت کے اختتام تک ہندوستان میں نیولبرل ایجنڈا بڑے پیمانے پر لاگو کیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود جو رہی سہی کسر تھی وہ مودی کے ذریعے پوری کی جا رہی ہے جس کے خلاف بڑے پیمانے پر ہڑتالیں موجود ہیں۔ لیکن اس دوران ہندوستان کو نہ صرف سرمایہ داروں کے لیے کھول دیا گیا بلکہ خطے میں امریکی سامراجی عزائم کی تکمیل کے لیے بھی ہندوستان کے حکمرانوں نے اپنی خدمات بڑھ چڑھ کر پیش کیں۔

اس کی ایک وجہ خطے میں چین کا بڑھتا ہوا اثر ورسوخ ہے جس کو ہندوستان اور امریکی حکمران دونوں روکنا چاہتے ہیں۔ امریکی سامراج کی کمزور ہوتی ہوئی طاقت اور امریکہ کے معاشی بحران نے جو خلا پیدا کیا اسے چین نے پُر کرنے کی کوشش کی اور دنیا میں ابھرتے ہوئے سامراج کی حیثیت سے دنیا میں طاقت کا توازن تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ چین کے سامراجی کردار پر تفصیلی بحث درکار ہے جو عالمی تناظر کی بحث کا موضوع ہوسکتی ہے لیکن یہاں اس پر مختصراً ہی گفتگو کی جاسکتی

ہے۔چین کی ابھرتی ہوئی سامراجی طاقت گو کہ پوری دنیا میں اس وقت بڑے اثرات مرتب کر رہی ہے اور بہت سی جگہوں پر امریکی سامراج کو چیلنج بھی کر رہی ہے لیکن اس کے رستے میں سب سے بڑی رکاوٹ اس کی نامیاتی کمزوری ہے۔چینی سامراج ماضی کی عالمی سطح کی سامراجی طاقتوں سے مختلف ہے۔ایک تو چین میں ہونے والی حالیہ ترقی خود چین میں ہونے والے کسی انقلاب کی مرہون منت نہیں بلکہ ایک ردانقلاب کا نتیجہ ہے جس میں منصوبہ بند معیشت کو ختم کر کے منڈی کی معیشت کو رائج کیا گیا۔اسی وجہ سے چین نے ذرائع پیداوار کو ترقی دینے یا نئی صنعتی ایجادات کی وجہ سے معاشی ترقی حاصل نہیں کی بلکہ اپنی سستی لیبر کے باعث دنیا بھر سے جدید اشیا بنانے والی کمپنیوں کو متوجہ کر کے کی۔امریکہ، یورپ اور جاپان جیسی ترقی یافتہ معیشتوں سے سرمایہ منتقل ہو کر چین میں آیا جہاں سرمایہ داروں نے منصوبہ بند معیشت کی بنیاد پر حاصل ہونے والی ہنر مند مگر سستی لیبر اور انفرااسٹرکچر کا فائدہ اٹھایا۔گو کہ اس دوران تکنیک میں تمام تر ترقی اور جدید تحقیق انہی ممالک میں زیادہ ہوتی رہی۔اس لیے چین کی تمام تر معیشت جدید سرمایہ دارانہ ممالک میں ہونے والی ترقی کی ہی مرہون منت رہی اور ابھی تک ہے۔اسی طرح چین میں ہونے والی تمام تر معاشی ترقی کے ثمرات وہاں کی آبادی کی بڑی اکثریت تک نہیں پہنچ سکے جو غربت کی کھائی میں مزید گرتے چلے گئے۔اسی باعث چین کی معیشت کی بنیاد برآمدات ہی تھیں۔جب تک یورپ اور امریکہ میں معاشی عروج رہا چین کی مصنوعات فروخت ہوتی رہیں لیکن جیسے ہی وہاں معاشی زوال آیا چین کی معیشت ہچکولے کھانے لگی۔اس دوران چین کی معیشت مینوفیکچرنگ سے نکل کر مصنوعی مالیاتی بلبلوں کی جانب چلی گئی۔جو آج شدید بحران کا شکار ہے۔

اسی طرح چین ایک سامراجی قوت کے طور پر اس وقت ابھر رہا ہے جب عالمی معیشت اور عالمی سطح پر سرمایہ دارانہ نظام ایک شدید ترین بحران میں ہے جو چین کی معیشت کو بھی اس بحران میں تیزی سے گھسیٹ رہا ہے۔اس لیے چین کا سامراجی کردار ابھرنے کے دوران ہی زوال کی جانب بھی مائل ہے۔چین نے عالمی سامراجی مالیاتی اداروں میں اپنے بڑھتے ہوئے قد کے مطابق حصہ نہ ملنے کے باعث نئے بینک بھی بنائے ہیں جن کے ذریعے پوری دنیا میں بڑے پیمانے پر قرضے دیے جا رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ان بینکوں کا مستقبل مخدوش ہے کیونکہ معاشی بحران اور عالمی سطح پر تیل اور دیگر اجناس کی قیمتوں میں کمی کے باعث ان قرضوں کی واپسی یقینی نہیں۔لیکن چینی سامراج کے غیر یقینی مستقبل کے باوجود اس وقت پوری دنیا اور بالخصوص اس خطے

میں چین ایک سامراجی طاقت کے طور پر ابھرا ہے اور یہاں اس نے امریکی رٹ کو چیلنج کیا ہے۔ گوادر میں بننے والی بندرگاہ جہاں خلیج فارس میں امریکی اجارہ داری کو چیلنج کر رہی ہے وہاں چین سری لنکا، بنگلہ دیش اور برما میں بھی اہم بندرگاہیں تعمیر کر رہا ہے جو بحرِ ہند میں اس کے سامراجی عزائم کا کھلا اظہار ہے۔ سری لنکا میں اپنے سامراجی عزائم کی تکمیل کے لیے چین نے سری لنکا کے سابق وزیراعظم راجپسکا کی انتخابی مہم کے لیے بھی گیارہ لاکھ ڈالر کی فنڈنگ کی تاکہ اپنی مرضی کے وزیراعظم سے مرضی کے معاہدے کیے جاسکیں۔ اسی طرح اکتوبر میں چینی صدر کے بنگلہ دیش کے دورے کے دوران وہاں 20 ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کا اعلان کیا گیا۔ نیپال اور برما سے بھی چین کے تعلقات میں قربت آئی ہے جس کی وجہ سے ہندوستان کے حکمران مشکلات کا شکار ہیں اور اسی باعث نیپال کی سرحد کئی ہفتوں تک بند رکھی گئی جس کے باعث وہاں جانے والی بنیادی اشیائے ضرورت کی قلت پیدا ہوگئی۔ چین کے یہ تمام اقدامات ہندوستان کی ریاست کے لیے کھلا چیلنج ہیں اور خطے میں اس کے اثر ورسوخ کے خاتمے کے خطرے کا اعلان ہیں۔ اسی باعث ہندوستان اور چین کے درمیان کشیدگی میں اضافہ بھی ہوا ہے جس میں ہمیں ہندوستان کی ریاست اروناچل پردیش میں چین کی بڑھتی ہوئی مداخلت نظر آتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی خطے میں چین کے سب سے زیادہ معاشی مفادات بھی ہندوستان کے ساتھ وابستہ ہیں۔ دونوں ممالک کی باہمی تجارت سوا ارب ڈالر سالانہ سے تجاوز کر رہی ہے جس میں چین سے برآمد کی جانے والی مصنوعات کا پلڑا کافی بھاری ہے۔ چین کسی بھی صورت میں یہ منڈی ہاتھ سے نکلنے نہیں دے سکتا۔ اسی طرح دونوں ممالک برکس بینک کے بنیادی رکن بھی ہیں جو اپنے آپریشنز کا آغاز کرنے جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ چین اور امریکہ کی باہمی تجارت کا حجم 2015ء میں 598 ارب ڈالر تھا۔ جس میں امریکہ 336.2 ارب ڈالر کے خسارے میں تھا۔ اس حوالے سے تمام تر تنازعات کے باوجود چین اور امریکہ کے معاشی مفادات ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اس تجارت کے علاوہ عالمی معیشت کو مستحکم رکھنے کے لیے بھی دونوں کا باہمی تعاون اشد ضروری ہے۔ ڈالر کی شکل میں غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخائر ہوں یا سستی مصنوعات کی فراہمی چین امریکہ کے لیے ناگزیر بھی ہے لیکن اس کے باوجود عالمی سطح پر اپنا پلڑا بھاری رکھنے کے لیے ایک دوسرے کیخلاف کاروائیاں بھی جاری رہتی ہیں۔

اسی حوالے سے پاکستان اور افغانستان کی صورتحال بھی نظر آتی ہے جو کہ چین اور امریکہ کے

سامراجی عزائم میں کٹھ پتلی کا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ امریکہ سے ڈالروں کی آمد کے بند ہونے کے سلسلے کو وقتی طور پر چینی سامراج کی آنے والی سرمایہ کاری نے پورا کیا ہے لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر نہیں چل سکتا۔ مگر اس دوران پاکستانی ریاست چینی حکمران طبقے کے سامراجی طوق کو بخوشی گلے میں پہن چکی ہے۔ یہاں سوال یہ ابھرتا ہے کہ جہاں عالمی سطح پر سامراجی طاقتیں کمزور ہو رہی ہیں اور معیشت ایک بحران کی جانب تیزی سے گامزن ہے وہاں پاکستانی ریاست مستحکم ہو سکتی ہے یا یہ کہ کیا چینی حکمران پاکستان کی ریاست کو مضبوط کریں گے۔ اس کے جواب کے لیے مشرقِ وسطیٰ پر محض ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔ وہاں سامراجی قوتوں کی مداخلت سے اگر کوئی استحکام آیا ہوتا یا ترقی اور خوشحالی ہوتی تو وہ سب کو نظر آ جاتی لیکن وہاں ہمیں خون کی ندیاں بہتی ہوئی نظر آتی ہیں اور ماضی کی مضبوط ریاستیں دھڑام سے گرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

ایسی ہی کیفیت پاکستان کی بھی ہے جس کی ریاست تیزی سے کھوکھلی ہوتی جا رہی ہے۔ امریکی اور چینی سامراجی طاقتوں کی غلامی کے ساتھ ساتھ یہاں سعودی عرب اور ایران کی سامراجی جنگ نے بھی اپنے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ امریکی سامراج کی گماشتگی کرنے کے ساتھ ساتھ پاکستانی ریاست امریکہ کی ہی گماشتہ ریاست سعودی عرب کی بھی گماشتگی کرتا رہا ہے۔ سعودی عرب کا یہاں گہرا اثر و رسوخ رہا ہے۔ اپنے تیل کو سعودی عرب نے یہاں سامراجی عزائم کی تکمیل کے لیے استعمال کیا ہے اس کے علاوہ یہاں سے سستی لیبر کا بھی بڑے پیمانے پر اپنے ملک میں استحصال کیا ہے جہاں کسی بھی قسم کے مزدور قوانین کی عدم موجودگی پر پاکستان نے کبھی کوئی آواز بلند نہیں کی۔ اسی طرح یہاں مدرسوں میں اپنے مخصوص نقطہ نظر کو پروان چڑھا کر ان لاکھوں طلبا کو اپنی خونی جنگوں کے لیے استعمال کروایا ہے اور پاکستانی ریاست نے اس عمل میں کبھی رخنہ نہیں ڈالا بلکہ اس کی حمایت کی ہے۔ یہاں کی افواج کو ملنے والا مفت تیل ہو یا معیشت کو سہارا دینے کے لیے ادھار پر تیل ہو، پاکستانی ریاست کسی نہ کسی صورت میں اپنی خدمات کا معاوضہ طلب کرتی رہی ہے۔ لیکن عرب انقلاب کے بعد صورتحال بہت تیزی سے تبدیل ہو چکی ہے۔ حسنی مبارک کے ساتھ امریکی سامراج کی بے وفائی دیکھ کر سعودی عرب کے حکمرانوں نے امریکہ سے آزادانہ اپنی سامراجی پالیسی اختیار کرنے کی کوشش کی۔ سب سے پہلے تو امریکہ سے نکالے جانے والے تیل کی جدید تکنیک فریکنگ کو ناکام بنانے کے لیے تیل کی قیمتوں کو لمبے عرصے تک کم رکھا گیا لیکن بعد ازاں عالمی معیشت میں سست روی کے باعث تیل کی مانگ میں کمی

کے باعث یہ کم قیمتیں مستقل حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔ اس دوران سعودی حکمرانوں نے مصر کے نئے حکمرانوں کو امریکی امداد ٹھکرا کر خود امداد دینے کی پیشکش کی اور بڑے پیمانے پر رقم ان کو دی تا کہ امریکہ کے مقابلے میں اپنے سامراجی پنجے گاڑے جا سکیں۔ یہاں نواز شریف کو بھاری مینڈیٹ دلوانے میں بھی ان کا کردار نظر آتا ہے، اسی طرح نواز شریف کو ڈیڑھ ارب ڈالر کا تحفہ بھی اسی گماشتگی کو زیادہ شدت سے جاری رکھنے کے لیے دیا گیا۔ اسی کے بدلے یمن میں جنگ کے لیے پاکستان کی افواج کی خدمات بھی طلب کی گئیں جسے بظاہر پاکستان کے حکمرانوں نے ٹھکرا دیا۔

لیکن اس دوران امریکہ اور ایران کے تعلقات کی بحالی نے پوری صورتحال کو مزید پیچیدہ کر دیا۔ ایران پاکستان کا ہمسایہ ہونے کے باوجود عالمی سطح کی پابندیوں کے باعث یہاں تجارت نہیں کر سکتا تھا۔ خاص کر ایران کا تیل یہاں سرکاری طور پر خریدا نہیں جا سکتا تھا۔ امریکہ سے تعلقات نے صورتحال کو تبدیل کیا اور ایران سے تجارت اور تیل کی درآمد کی آپشن اب پاکستان کی ریاست کے پاس موجود ہے۔ اس دوران ایران کی ملا اشرافیہ اپنے مخصوص مذہبی عقائد بھی پاکستان میں پھیلاتی رہی اور اسی کے ذریعے یہاں اپنے سامراجی عزائم کی تکمیل کرتی رہی ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کی موجودہ صورتحال نے ایران اور سعودی عرب کے تضادات کو بھڑکا دیا ہے۔ شام، لبنان، عراق، یمن اور بحرین سمیت ہر جگہ دونوں ممالک کے سامراجی عزائم ایک دوسرے سے متصادم ہیں اور یہ دونوں طاقتیں ایک دوسرے کو ہر صورت شکست دینا چاہتی ہیں۔ لیکن اسی دوران سعودی عرب کا بجٹ خسارہ بڑھتا جا رہا ہے اور اس کی ریاست شکست و ریخت کا شکار ہے اور آنے والے زلزلے اس میں مزید دراڑیں ڈالنے کی طرف جائیں گے۔ ان دونوں ممالک کے مذہبی عقائد پر اجارہ داری اور ان عقائد کے فروغ اور ان کے پردے میں اپنے سامراجی عزائم کی تکمیل کے لیے بڑے پیمانے پر فنڈنگ کی جاتی ہے۔ جس سے نہ صرف پاکستانی ریاست مستفید ہوتی ہے بلکہ ریاست کی پالتو بہت سی تنظیمیں بھی مالی مفاد حاصل کرتی ہیں۔ بالخصوص شام کی خانہ جنگی میں دونوں جانب سے پاکستان سے ہزاروں کی تعداد میں افراد کو بھاری تنخواہ پر ریکروٹ کیا جا رہا ہے اور پاکستان سامراجی جنگوں میں کام آنے والے سپاہی مہیا کرنے والا ملک بن کر رہ گیا ہے۔

اسی طرح ترکی بھی مشرقِ وسطیٰ میں ایک اہم سامراجی ملک بن کر ابھرا ہے اور اب شام کی خانہ جنگی میں براہ راست شریک ہے۔ دوسری جانب ترکی امریکہ اور نیٹو کا بھی اتحادی ہے، یورپی

یونین میں غیر ممکنہ شمولیت کے لیے بھی نام نہاد مذاکرات کر رہا ہے اور روس سے بھی قریبی تعلقات استوار کیے ہوئے ہے۔ پاکستان کے حکمرانوں نے ترکی کو بھی تابعداری کا یقین دلایا ہے اور اس کے ذریعے بھی اپنی دولت میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ اسی طرح قطر نے بھی عرب انقلابات کے بعد سعودی عرب کے تیل کا مقابلہ اپنی گیس سے کرنے کی کوشش کی لیکن جلد ہی اسے سعودی عرب کے آگے سرنگوں ہونا پڑا۔ لیکن اس دوران طالبان سے مذاکرات اور ان کا سفارت خانہ کھولنے میں قطر نے اپنا کردار ادا کیا۔ پاکستان کے حکمرانوں نے یہ موقع بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور یہ انتہائی مہنگے داموں خریدی ہوئی گیس عوام کے پلے باندھ کر بھاری کمیشن کھا چکے ہیں۔

روس کے ساتھ ہونے والی حالیہ فوجی مشقوں کو بھی بڑھا چڑھا کر میڈیا میں پیش کیا جا رہا ہے۔ روس بھی اس سارے عرصے میں ایک سامراجی طاقت کے طور پر ابھرا ہے اور اس نے مشرقی یورپ سے لے کر شام تک ہر جگہ امریکہ اور یورپی سامراجی ممالک کو ناکوں چنے چبوائے ہیں۔ امریکہ ایک دفعہ پھر اپنے خصی پن کے باعث روس کا مقابلہ نہیں کر سکا اور بہت سے مقامات پر اسے روس کے لیے جگہ خالی کرنی پڑی ہے۔ لیکن خود روس کی معیشت شدید بحران کا شکار ہے اور دیوالیہ پن کے نزدیک ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے سامراجی عزائم سے پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں۔ بلکہ ان وقتی کامیابیوں کو وہ مالی مفادات کے حصول کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پاکستان یا بھارت کو اسلحے کی فروخت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ افغانستان اور وسطی ایشیائی ممالک میں بھی روس کا اثر رسوخ بڑے پیمانے پر موجود ہے جو پاکستان کے ساتھ تعلقات پر اثر انداز ہوگا۔ برطانیہ، جرمنی، فرانس اور دیگر یورپی ممالک کا اس خطے میں اثر و رسوخ دیگر کے مقابلے میں کم ہے لیکن آنے والے عرصے میں طاقتوں کے توازن میں تبدیلی انہیں بھی اہم مواقع فراہم کر سکتی ہے۔

اس تمام تر پس منظر میں پاکستانی ریاست کا استحکام ناممکن ہے۔ اتنی مختلف اور متصادم سامراجی طاقتوں سے ایک ہی وقت میں بہتر تعلقات نہیں رکھے جا سکتے۔ ایک طرف تو ان تمام طاقتوں سے مفاد حاصل کرنے کی کوشش میں حکمرانوں نے اس پورے ملک کو ایک خونی اکھاڑہ بنا دیا ہے جہاں مختلف سامراجی ممالک اپنی لڑائیاں لڑتے ہیں اور ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مذہبی بنیادوں پر فرقہ وارانہ تضادات ہوں یا سیاسی پیک کے حق یا مخالفت میں سیاست، دونوں جانب مقامی قوتیں کسی نہ کسی سامراجی طاقت کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ایسے

میں خود پاکستانی ریاست کئی دھڑوں میں تقسیم ہو چکی ہے اور ہر دھڑا اپنے مالی مفادات کے تحفظ کے لیے کسی بھی سطح تک جانے کے لیے تیار ہے۔ معیشت کے بحران نے ریاست کو داخلی طور پر پہلے ہی کمزور کر دیا ہے اور ریاست کے تمام ستون کالے دھن کی معیشت کے سہارے کھڑے ہیں۔ اس ساری لڑائی نے جہاں عدلیہ، پارلیمنٹ اور بیوروکریسی کو گھن کی طرح کھا لیا ہے وہاں پاکستانی ریاست کے سب سے مضبوط ادارے فوج کو بھی مختلف دھڑوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ عمران خان کے پچھلے دھرنے میں یہ تقسیم واضح ہو کر سامنے آ گئی تھی اور پورے میڈیا میں آئی ایس آئی اور آرمی چیف کے مابین تضادات پر کھل کر گفتگو ہو رہی تھی۔ یہ تضادات حل ہونے کی بجائے مزید شدت اختیار کر گئے ہیں اور حال ہی میں ڈان میں آنے والی ایک رپورٹ نے اس کو مزید واضح کیا ہے۔ اس رپورٹ میں واضح طور پر نظر آتا ہے کہ ایک لمبے عرصے سے جاری دہشت گردوں کی شکل میں تزویراتی اثاثے بنانے کی پالیسی کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جہاں پاکستان اتنی زیادہ سامراجی طاقتوں کی خدمت کر رہا ہے وہاں یہ واویلا بھی کیا جا رہا ہے کہ پاکستان تنہا رہ گیا ہے۔ اس لیے اسے پالیسی تبدیل کرنی ہوگی۔ لیکن اس سے پہلے دیکھنا ہوگا کہ ریاست کے اداروں کی کیا کیفیت ہے۔

فوج

جولائی میں سینیٹ میں وزیر دفاع کی جانب سے جمع کرائی گئی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان کی فوج اس وقت پچاس کمرشل منصوبے چلا رہی ہے۔ ان منصوبوں کو فوجی فاؤنڈیشن، شاہین فاؤنڈیشن، بحریہ فاؤنڈیشن، آرمی ویلفیئر ٹرسٹ اور ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کے ذریعے چلایا جا رہا ہے۔ آٹھ شہروں میں ڈی ایچ اے قائم کیے گئے ہیں۔ جبکہ سولہ منصوبے آرمی ویلفیئر ٹرسٹ، پندرہ فوجی فاؤنڈیشن جبکہ گیارہ شاہین فاؤنڈیشن کے تحت چل رہے ہیں۔ اخبارات میں ان تمام منصوبوں کی تفصیلات درج ہیں جن میں فوجی فاؤنڈیشن کی جانب سے شمالی افریقہ کے ملک مراکش میں قائم کی جانے والی فاسفور کمپنی سے لے کر یہاں موجود سیمنٹ اور گیس کی کمپنیاں تک شامل ہیں۔ پاکستان کے موجود ریاستی ڈھانچوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا درست ہوگا کہ یہ فہرست کسی بھی صورت مکمل نہیں ہو سکتی۔ بہت سے ایسے کاروبار اور منصوبے ہوں گے جن کی تفصیلات سینیٹ کو نہیں دی گئی ہوں گی۔ اس کے علاوہ کالا دھن پاکستانی ریاست کے تمام اداروں

کی نس نس میں سرائت کر چکا ہے جس میں فوج کے ادارے کا ملوث ہونا ناگزیر ہے۔ ایسے میں فوج کا ادارہ پاکستان کی معیشت کے ایک بڑے حصے میں براہ راست ملوث ہے۔ اس لیے اس کا حجم جتنا سطح پر نظر آتا ہے سطح سے نیچے اس سے کہیں زیادہ ہے۔ دفاعی بجٹ میں ہر سال اضافے سے لے کر اسلحے کے سودوں میں کمیشن تک بہت سے ایسے معاملات ہیں جن میں یہ ادارہ اپنا حق جتاتا ہے۔ لیکن ان تمام کاروباروں اور سودوں کے باعث اس کا دفاعی اور تزویراتی کردار اس کے مالیاتی کردار کے تابع ہو چکا ہے۔ سول حکومت سے اس کے تعلقات بھی انہی مفادات کے تابع ہیں۔ دوسرا اتنے بڑے حجم کے ادارے کا معاشی اور سیاسی بحران کے دوران متجانس رہنا ممکن نہیں۔ یہ بحرانات فوج کی چین آف کمانڈ پر براہ راست اثرات مرتب کرتے ہیں۔ خاص طور پر ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹیوں سمیت پراپرٹی کے بڑھتے ہوئے کاروبار نے اس ادارے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور فوج اس وقت ایک دفاعی ادارے سے پراپرٹی کی خرید و فروخت کرنے والا ادارہ زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ اسی پراپرٹی کی خرید و فروخت کو بہتر کرنے کے لیے زمینوں پر قبضے سے لے کر دوسرے پراپرٹی ڈیلروں کو ناکام کرنے کے لیے فوج کو سیاست میں بھی مداخلت کرنا پڑے تو اس سے گریز نہیں کیا جاتا۔ ایسے میں اس فوج کی لڑائی لڑنے کی صلاحیت پر یقیناً سوالیہ نشان ابھرتا ہے۔ واضح طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ فوج کوئی بڑی جنگ لڑنے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور اگر کوئی ایسی صورتحال بنی تو خود یہ ادارہ ریت کی دیوار ثابت ہوگا۔ لیکن یہ ادارہ اپنے مالیاتی مفادات کے تحفظ کے لیے اپنے ہی ملک کے نہتے افراد کیخلاف ہر انتہا تک جا سکتا ہے۔ چین سے آنے والی بھاری سرمایہ کاری میں بھی اس ادارے نے اپنا مطلوبہ حصہ نہ ملنے پر بہت سے گلے شکوے کیے۔ جس میں دارالحکومت میں آرمی چیف کے لیے لیف لیٹ تقسیم کرنے سے لے کر بینر آویزاں کرنے تک سب ہتھکنڈے شامل تھے۔ لیکن اس ادارے کے مذکورہ بالا معاشی اور مالیاتی حجم اور اس سے متصل سیاسی و سماجی دست اندازیوں کو بھی ایک مربوط کل نہیں سمجھنا چاہئے۔ فوج پر مہربان ہونے والی کالی یا سفید معیشت کی دیوی بھی خود فوج کی بالائی پرتوں کے اندر ہموار اور یکساں عنایات کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اس لئے اس فوج کا جنرل بھی آخری تجزیئے میں کسی ایک گروہ کے مالیاتی مفادات کی نمائندگی ہی کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام دھڑے نام نہاد محبوب جنرل کی مدت ملازمت میں توسیع جیسے مسئلے پر متفق نہیں ہو سکتے۔ ہاں البتہ بحیثیتِ مجموعی لوٹ مار میں عسکری حصے کو بڑھانے کے لئے سول اداروں کے مخالف کچھ یکساں مفادات ہی اب اس

ادارے کو ایک اکائی کی شکل میں قائم رکھے ہوئے ہیں۔ یوں وقتاً فوقتاً اور حسبِ ضرورت سول حکومت پر دباؤ اور گرفت مضبوط کرنی ضروری ہوتی ہے۔ حکومت پر حالیہ دباؤ ڈالنے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اقتصادی راہداری کے لیے بنائی جانے والی بارہ ہزار افراد کی سکیورٹی فورس کے اخراجات کا بل پاکستان کے عوام ادا کریں گے۔ ایک حالیہ اعلان کے مطابق اس سکیورٹی فورس کے اخراجات کے لیے بجلی کے بلوں میں نیا ٹیکس لگایا جائے گا۔ یعنی فوج کے مالیاتی مفادات کا حصول اب بجلی کے بلوں تک بھی پہنچ چکا ہے۔ پہلے ہی عوام آئی ایم ایف کے قرضوں کے سود کی قسطیں اتارنے کے لیے بجلی، گیس، پانی سمیت ہر ضروری شے پر کئی ٹیکس ادا کرتے ہیں اب فوج کے اخراجات کا نیا بوجھ بھی شامل ہو گیا ہے۔ یہ جہاں اس ادارے کی سماج پر گرفت کا پتہ دیتا ہے وہاں اس کے حد سے بڑھتے ہوئے حجم کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ آنے والے طوفانوں کے تھپیڑے ریاست کے اس بظاہر مضبوط ادارے کا کھوکھلا پن محنت کشوں پر مزید واضح کریں گے۔ اس اہم ادارے کی ٹوٹ پھوٹ میں یہاں موجود طبقاتی تضاد کلیدی کردار ادا کرے گا۔ اعلیٰ افسران کی پر تعیش زندگیوں کیخلاف داخلی محاذ پر مرنے والے وردی میں ملبوس محنت کشوں میں شدید نفرت موجود ہے۔ آنے والے عرصے میں یہ مزید بھڑکے گی اور اس ملک کے سوشلسٹ انقلاب میں اہم کردار ادا کرے گی۔

ایک سوشلسٹ انقلاب کے بعد اس ادارے کا مکمل خاتمہ کر دیا جائے گا اور اس کی جگہ انقلابی بنیادوں پر ایک نیا ادارہ قائم کیا جائے گا۔ مزدور ریاست میں فوج کا ادارہ محنت کش عوام پر حکمرانی کرنے کے لیے نہیں بلکہ انقلاب کا دفاع کرنے کے لیے قائم کیا جاتا ہے جس میں نہ صرف منتخب قیادت موجود ہوتی ہے بلکہ یہ عوام کے جمہوری کنٹرول میں ہوتا ہے۔ روس میں انقلاب کے بعد ٹراٹسکی نے انہی بنیادوں پر ہی سرخ فوج قائم کی تھی۔ آج بھی اسی طریقہ کار سے زیادہ جدید بنیادوں پر ایسا ہی ادارہ انقلاب کے بعد تعمیر کیا جا سکتا ہے۔

پارلیمنٹ

پاکستان کی پارلیمنٹ کبھی بھی ایک مضبوط ادارے کے طور پر قائم نہیں ہو سکی۔ فوجی آمروں سے لے کر سامراجی طاقتوں تک ہر کسی نے اسے عوام کو ایک دھوکہ دینے کے لیے استعمال کیا ہے۔ آج بھی کوئی سنجیدہ فیصلے پارلیمنٹ میں نہیں کیے جاتے۔ فیصلے پہلے ہی واشنگٹن، بیجنگ اور جی ایچ

کیو میں ہوجاتے ہیں جن کی اس ربڑ اسٹیمپ پارلیمنٹ سے توثیق کرائی جاتی ہے۔ یہاں کے حکمران خود اس حقیقت کو جانتے ہیں اور کبھی بھی اسمبلی کے اجلاسوں کو سنجیدہ نہیں لیتے۔ عمران خان نے اپنی حالیہ مہم میں خود ریاست کے اس ادارے کی حقیقت عیاں کر دی ہے جب تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا کہ انتخابات میں کس طرح منظّم دھاندلی کی جاتی ہے۔ بالآخر عمران خان بھی دھاندلی کی تحقیقات کروانے سے بھاگ چکا ہے۔ کیونکہ یہ وہی دھاندلی زدہ انتخابات ہیں جن کے ذریعے اسے بھی پختونخواہ میں حکومت بنانے کا موقع ملا۔ یہ ریاست ملک میں مردم شماری نہیں کرواسکتی تو یہ شفاف انتخابات کیسے کرواسکتی ہے۔ اگر مردم شماری صحیح بنیادوں پر شروع ہوئی تو ملک میں ایک خانہ جنگی کی فضا پیدا ہوسکتی ہے۔ ہر قوم اور علاقے میں موجود حکمران طبقے کے افراد اپنی مرضی کے نتائج لکھوانے کی کوشش کریں گے اور اپنی آبادی کو بڑھا چڑھا کر پیش کریں گے تاکہ اس کے مطابق زیادہ فنڈ حاصل کرسکیں۔ ریاستی ادارے اس کیفیت میں نہیں کہ اس مزاحمت کا مقابلہ کرسکیں۔ پچھلی مردم شماری کے لیے فوج کی خدمات حاصل کی گئیں تھی۔ اب ریاست کی حالت یہ ہے کہ فوج کے ذریعے بھی یہ کام نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے میں شفاف انتخابات کا اس نظام میں تصور کرنا بھی بیوقوفی ہوگی۔ صرف ایک وسیع عوامی تحریک کی موجودگی میں اس تحریک کو زائل کرنے کے لیے انتخابی ڈرامے میں کسی حد تک حقیقت کا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے لیکن شفاف انتخابات کرانا تب بھی ممکن نہیں ہوگا۔ اس ریاست میں ایسی صلاحیت ہی موجود نہیں۔ اس لیے پارلیمنٹ کا ادارہ منتخب افراد پر نہیں بلکہ ہر علاقے میں حکمران طبقے کے منظور نظر افراد پر مبنی ہے۔ ایسے میں ان انتخابات اور اس پارلیمنٹ کی قلعی محنت کش عوام پر بھی کھل چکی ہے اور ان کی اس ادارے سے کوئی امید وابستہ نہیں۔ صرف میڈیا کے ذریعے اس ادارے کے اجلاسوں کو عوامی شعور پر مسلط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن عوام کے لیے یہ ایک سرکس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس سرکس میں اصلاحات کی کوئی گنجائش موجود نہیں اور نہ ہی یہاں سے کوئی قانون پاس کروا کر محنت کشوں کے کسی بھی حصے کو ریلیف دلوایا جاسکتا ہے۔ کروڑوں روپے کی سرمایہ کاری کر کے پارٹیوں کے ٹکٹ حاصل کرنے والے اس سرکس میں کروڑوں کو اربوں میں بدلنے کے لئے ہی جاتے ہیں۔ بہت سے تو ایسے ہیں جو دیگر انتہائی اہم کاموں میں اتنے مشغول ہوتے ہیں کہ انہیں آرام کرنے اور ستانے کا وقت ہی نہیں ملتا ان کے لئے 'نیندیں' پوری کرنے کے لئے پارلیمنٹ کے اجلاس سے زیادہ موزوں جگہ کیا ہوسکتی ہے۔ یوں وہ اس بے کار کی سرگرمی کو بھی معنی اور مفہوم دے دیتے

ہیں۔ 'گریجوایٹ' اسمبلیوں کا تجربہ بھی بری طرح ناکام ہوا۔ باقی بھی اس طرح کا کوئی مصنوعی حربہ اس پارلیمنٹ کے جعلی اور گماشتگی کے کردار کو نہیں بدل سکتا۔ ان اسمبلیوں کی مدت پوری ہو جانے یا ان کے تقدس کا پرچار کرنے والے قابلِ نفرت ہی نہیں قابلِ رحم بھی ہیں۔ بہت سے نام نہاد انقلابی حکمران طبقے کے غلیظ ترین افراد کے تلوے چاٹ کر بورژوا پارٹیوں کے ٹکٹوں کی دوڑ میں لگے رہتے ہیں تاکہ اول تو اس بدبودار پارلیمنٹ سے مستفید ہوا جا سکے، دوم اگر وہاں تک رسائی نہ بھی ہو تو اس ٹکٹ کو ایک سیاسی چیک کے طور پر کیش کروا کر ٹھیکوں اور مراعات میں خاطر خواہ حاصلات لی جا سکیں۔ اس کے لیے ذہنی تسکین اور ضمیر کی خلش مٹانے کے لیے بالشویک پارٹی کی تاریخ سے مثالیں دی جاتی ہیں۔ اس وقت یقیناً لینن نے مخصوص حالات میں زار روس کی بنائی ہوئی پارلیمنٹ (ڈوما) میں جانے کی مخصوص حالات میں فوری مقاصد کے لیے حمایت ضرور کی تھی لیکن اس کے ذریعے بدعنوانی اور لوٹ مار کا حصہ بننے والوں یا اس ادارے سے ذاتی مفادات حاصل کرنے والوں سے لینن نے ناقابل مصالحت لڑائی لڑی تھی۔ آج بھی انہی بنیادوں پر اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح ہے کہ اس سرکس کا حصہ بن کر کبھی کوئی تبدیلی یا اصلاحات نافذ نہیں کروائی جا سکتیں۔ ایک انقلابی تحریک کے ذریعے اس ادارے کو اکھاڑنے کی ضرورت ہے اور اس کی جگہ سوویتوں کے نظام کو رائج کرنے کی ضرورت ہے جو صرف ایک سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے ہی کیا جا سکتا ہے۔

عدلیہ

2007ء میں عدلیہ کی آزادی کی تحریک کے بعد سے عدلیہ کی کرپشن اور لوٹ مار میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ نیچے سے لے کر اوپر تک ہر سطح پر بڑے پیمانے پر بدعنوانی موجود ہے اور ہر کوئی لوٹ مار میں اپنا زیادہ سے زیادہ حصہ حاصل کرنے کے لیے سرگرم ہے۔ بورژوا ریاست میں عوام پر سرمایہ دار طبقے کی حکمرانی قائم رکھنے کے لیے انصاف کے نام نہاد تقاضے پورے کیے جاتے ہیں تاکہ عوام کا ریاستی اداروں پر اعتماد موجود رہے۔ اسی اعتماد کے باعث مختلف تحریکوں کو زائل کرنے کے لیے انہیں عدالتوں کی پیچیدگیوں میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ ان عدالتوں اور قانون کا بنیادی مقصد نجی ملکیت کا تحفظ ہے۔ لیکن اپنے زوال اور ٹوٹ پھوٹ کے باعث عدالتیں یہ کردار بھی فعال انداز میں ادا نہیں کر سکتیں۔ دوسرا عوام کا ان عدالتوں پر اعتماد ختم ہو چکا ہے اور ہر کوئی سمجھتا

ہے کہ یہاں انصاف کا دور دور سے بھی کوئی تعلق نہیں۔صرف پیسہ چلتا ہے اگر آپ عدالتی نظام کے کل پرزوں کو خرید سکتے ہیں تو اپنی مرضی کے نتائج حاصل کر سکتے ہیں ورنہ فیصلہ آپ کیخلاف آئے گا۔اسی طرح ریاست کے زوال کے باعث متوازی ادارے بھی وجود میں آ چکے ہیں۔فوجی عدالتوں کا قیام درحقیقت اس ادارے کے خصی پن کا خصوصی اظہار ہے۔اسی طرح جرگوں، پنچایتوں اور دوسرے کئی طریقوں سے فیصلے کیے جاتے ہیں۔کچھ علاقوں میں دہشت گرد تنظیمیں اپنی عدالتیں قائم کر کے فیصلے کرواتی ہیں۔اسی طرح ہر علاقے میں بااثر افراد اپنی عدالتیں لگاتے ہیں۔ایسے میں ریاست کے اس ادارے کے کردار پر سوالیہ نشان موجود ہے جہاں متوازی ادارے اس ادارے سے زیادہ فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔آنے والے دنوں میں ایسی مقامی عدالتوں کی تعداد اور عوام کے ان کی جانب رجحان میں اضافہ ہوگا اور ریاست کا یہ ادارہ مزید تباہی کی جانب بڑھے گا۔گزشتہ کچھ برسوں میں نہ صرف مالیاتی حصے داری بلکہ علاقائی اور عالمی سامراجوں کی باہمی کھینچا تانی میں بھی اس ادارے کا کردار کھل کر سامنے آ رہا ہے۔ریاست کا اپنی رِٹ بحال کرنے کے لئے اس ادارے پر انحصار جتنا بڑھے گا، اس کی عملداری اور تقدس اتنا ہی پائمال ہوگا۔ایک انقلابی تحریک اس ادارے کا مکمل خاتمہ کرنے کی جانب بڑھے گی اور اس کو اکھاڑ کر اس کی جگہ مزدور ریاست کے اداروں کو قائم کیا جائے گا۔

میڈیا

گزشتہ دو دہائیوں میں میڈیا بالخصوص الیکٹرانک میڈیا کا کردار بہت بڑھ گیا ہے۔گزشتہ حکومتوں میں اور خاص طور پر پرویز مشرف کی حکومت میں جب معیشت کے بلبلے بن رہے تھے تو اس شعبے میں بہت بڑی سرمایہ کاری دیکھنے میں آئی۔چونکہ یہ سرمایہ کاری نجی ہوتی ہے اس لئے بہت سے سادہ لوح سوال اٹھاتے ہیں کہ آپ میڈیا کو ریاستی ستون کیسے کہہ سکتے ہیں۔اصل میں پیمرا اور دیگر 'خفیہ' اداروں کے ذریعے ریاست ہی پرنٹ یا الیکٹرانک میڈیا کو کنٹرول کر رہی ہوتی ہے۔پھر سرکاری اشتہاروں اور دیگر 'ذرائع' کے بلبوتے پر کسی بھی چینل یا اخبار کے منہ میں اپنے الفاظ دے دیئے جاتے ہیں۔اگرچہ انفرادی طور پر صحافیوں کو اپنی بات کرنے کا سطحی سا ہی سہی موقع ضرور ملتا ہے مگر مالکان کا حتمی مقصد 'خبر' اور رائے کو ایک شے کے طور پر بیچ کر زیادہ سے زیادہ اشتہار حاصل کرنا ہی ہوتا ہے۔یوں میڈیا کی آزادی اپنی بنیاد میں ہی 'نسبتی' اور فروعی ہوتی ہے

جس کی ڈوریں کہیں اور سے ہلائی جا رہی ہوتی ہیں۔ ریاست کے بحران اور دراڑوں کے دنوں میں تو یہ نسبتی آزادی بھی اتنی دھندلا جاتی ہے کہ اس کا وجود ہی نہ ہونے کے برابر رہ جاتا ہے۔ گزشتہ برسوں میں پاکستانی میڈیا بھی ریاستی پراپیگنڈے کے ایک اہم اوزار کے طور پر سامنے آیا ہے جس میں بہت سارے 'بزعمِ خود' صحافیوں نے بہت نام اور مال بٹورا ہے۔ کالے دھن کا بڑا حصہ بھی اس کاروبار میں ملوث ہونے کی وجہ سے ہر کسی کو مالکان سے لے کر مڈل کلاس کے تجزیہ نگاروں تک کسی نہ کسی ریاستی دھڑے کی پشت پناہی کی آکسیجن ضرور درکار ہوتی ہے۔ اگرچہ حکمران طبقے کے ایک دھڑے کے طور پر میڈیا مالکان کے اپنے مخصوص طبقاتی مفادات بھی ہوتے ہیں لیکن جیسے اس بورژوازی کا باقی حصہ بھی کوئی آزادانہ کردار نبھانے کا اہل نہیں، ایسے ہی میڈیا مالکان سے اس قسم کی توقع رکھنا ہی بیوقوفی ہوگی۔

کچھ عرصہ پہلے تک پاکستانی میڈیا پر سعودی عرب کے خلاف کسی بھی قسم کی بات کرنے کی بالکل کوئی آزادی نہیں تھی۔ اب بھی سعودی نواز گرفت کافی مضبوط ہے مگر امریکہ اور ایران کے بیچ میں مصالحتی عمل میں پیشرفت کے باعث اور خود ایران کی سامراجی مداخلت میں اضافے کی وجہ سے کسی حد تک سعودی خاندان کی بے جا مداخلت زیرِ بحث آنے لگی ہے۔ خاص طور پر یمن میں فوج بھیجنے کے معاملے پر میڈیا میں اچھی خاصی لعن طعن دیکھنے میں آئی۔ فوج کے خلاف آج بھی کسی چینل یا اخبار میں کھل کر بات نہیں کی جا سکتی۔ ابھی حال ہی میں ڈان اخبار کے سکینڈل نے میڈیا کی آزادی کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ بلوچستان، وزیرستان کے معاملات میں میڈیا تو درکنار علاقائی اور صوبائی حکومتوں تک کو مداخلت کی اجازت نہیں ہے۔ چینی سرمائے کے کمیشنز کے لئے بلوچستان آپریشن میں بھیانک حد تک تیزی آئی ہے اور عام آدمی اپنے ہی گھر میں سزا یافتہ قیدی کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہیں مگر اس ضمن میں بات کرنے کی جرات کسی میں نہیں۔ اسی طرح سعودی چاہتے ہیں کہ جیسے ایران نے سعودی عرب کی سرحدوں کے آس پاس یمن کو خاص طور پر ایک بفر ریاست کے طور پر استعمال کرنے کے لئے حوثی قبائل کو استعمال کیا ہے اور بحرین میں بھی کوششیں جاری ہیں، اسی طرح سعودی عرب بلوچستان کو ایران کے لئے ایک سرخ بتی کے طور پر استعمال کرنے کی پالیسی پر کاربند ہے۔ پشتون علاقوں میں تو ان کے اثر و رسوخ کا ایک بہت طویل ماضی ہے مگر اب بلوچ آبادی کے علاقے جیسے تربت اور مکران ڈویژن وغیرہ میں بھی ریاستی آشیر باد سے دہشت گرد ملاؤں کی مکمل اجارہ داری ہے۔ ذرا سی بات پر کسی بھی شخص کو

کافر قرار دے کر قتل کرنا اور گھر کو آگ لگانا سماجی معمول بن چکا ہے۔ خاص طور پر پڑھے لکھے لوگوں کو ٹارگٹ کیا جاتا ہے۔ جگہ جگہ پر ریاستی اہلکار یا ان کی بی ٹیمیں لوگوں کو روک کر یا اٹھا لے جا کر کلمے سنتے ہیں اور ان کی تذلیل کرتے ہیں۔ اس صورتحال کا میڈیا میں تجزیہ تو درکنار اس کا حوالہ دینا بھی اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔

ایسے ہی محنت کش طبقے کی تحریکوں یا ہڑتالوں وغیرہ کی خبریں کسی اخبار یا ٹی وی چینل پر نہیں چل سکتیں۔ اسی وجہ سے میڈیا کے 'ٹھرکی' انقلابی دانشوروں کو ملک میں اور بالخصوص محنت کش طبقے کی تحریک اور شعور میں مسلسل جمود ہی دکھائی دیتا ہے۔ یہ صرف وہ دیکھتے ہیں جو میڈیا ان کا دکھاتا ہے۔ حقیقت میں ملک کے تمام صنعتی علاقوں، پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر کے چھوٹے بڑے اداروں میں تحریکیں کم یا زیادہ شدت سے چلتی رہتی ہیں اور گزشتہ کچھ عرصے میں اس سارے عمل میں بہت تیزی آئی ہے۔ لیکن بورژوا میڈیا پر ان تحریکوں کا ذکر کرنا شجرِ ممنوعہ ہے اور رہے گا۔ بعض انقلابی دانشور وٹی وی ٹاک شوز اور اخباری کالموں کے ذریعے انقلابی پروپیگنڈا کرنے کو باقاعدہ ایک انقلابی حکمتِ عملی سمجھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان تمام مذکورہ بالا موضوعات جو شجرِ ممنوعہ ہیں ان سے ہٹ کر کس حد تک انقلابی پروپیگنڈے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس لئے انقلابی پروپیگنڈے کے لئے بھی متبادل اور متوازی میڈیا تشکیل دینا ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لئے انقلابی اخبار، رسائل، کتابیں، پمفلٹس وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ بورژوا میڈیا میں کی جانی والی مداخلت اس کے لئے محض معاونت کا فریضہ ہی سرانجام دے سکتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ انقلابی لٹریچر اور اخبارات بورژوا میڈیا میں کئے گئے کام کے لیے معاون بن جائے۔ اس قسم کے کام سے مخصوص انقلابی لیڈروں کا احساسِ محرومی تو ختم کیا جاسکتا ہے اور ذاتی تشہیر و تسکین تو حاصل کی جاسکتی ہے مگر محنت کش طبقے کی وسیع تر پرتوں تک انقلابی نظریات لے کر جانا ناممکن ہے۔

بیوروکریسی

پاکستان کی بیوروکریسی کی بدعنوانی پوری دنیا میں مشہور ہے اور اسی لیے پاکستان دنیا کے چند بدعنوان ترین ممالک میں شمار کیا جاتا ہے۔ شناختی کارڈ بنوانے سے لے کر ٹیکس معاف کروانے تک ہر جگہ رشوت ایک لازمی عنصر بن چکی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ کوئی ایسا شعبہ اور کوئی ایسا ادارہ نہیں جو بدعنوانی سے پاک ہو۔ یہ تمام تر ریاستی ڈھانچہ ایسی حالت

میں پہنچ چکا ہے کہ اس کی اصلاح کی گنجائش ختم ہوگئی ہے۔ یہاں پر کچھ لوگ سیاست چمکانے کے لیے کرپشن کے خاتمے کی بات کرتے ہیں لیکن درحقیقت کرپشن کے خاتمے کا مطلب پورے ریاستی ڈھانچے اور مشینری کا خاتمہ ہے جو ایک سوشلسٹ انقلاب کے بغیر ممکن نہیں۔ 69-1968ء کے انقلاب کے بعد آنے والی جمہوری حکومت نے بیوروکریسی میں بڑے پیمانے پر اصلاحات کیں۔ بہت سے بیوروکریٹوں کو سزائیں دی گئیں۔ جس سے اس اہم ریاستی ادارے کو دوبارہ قدم جمانے کا موقع ملا۔ اسی کا نتیجہ ہمیں ایک بیوروکریٹ کے طاقتور صدر بننے کی شکل میں نظر آیا۔ غلام اسحاق خان نے دو منتخب حکومتوں کو برطرف کرنے میں اپنا کردار ادا کیا اور اسٹیبلشمنٹ کی بھرپور نمائندگی کی۔ لیکن آج ریاست کا یہ حصہ بھی بدترین گراوٹ اور زوال کا شکار ہے اور کوئی بھی فعال کردار ادا کرنے سے قاصر ہے۔ بلدیاتی اداروں کے انتخابات ہونے کے باوجود یہ ادارہ ابھی تک اختیار ان نمائندوں کو تمام صوبوں میں منتقل نہیں کر سکا۔ جو خود اس ریاست کے ایک اور بحران کی نشاندہی ہے۔ جہاں اقتدار کی منتقلی ہوئی ہے وہاں بھی بیوروکریٹوں کی گرفت ابھی تک موجود ہے۔ آنے والے دنوں میں اس کشمکش میں اضافہ ہوگا جو ریاست کو مزید کمزور کرنے کا باعث بنے گی۔ اسی طرح جہاں فوجی عدالتوں کے ذریعے فوج اور عدلیہ برسرپیکار ہیں وہاں فوجی بیوروکریسی اور سول بیوروکریسی کی بھی اختیارات کے حصول کی لڑائی میں شدت آئے گی اور دونوں ملکی خزانے کی لوٹ مار میں اپنا حصہ بڑھانے کی کوشش میں ایک دوسرے کو تباہ کرنے کی جانب بڑھیں گے۔ ایک سوشلسٹ انقلاب کے بعد اس ادارے کا مکمل خاتمہ کر دیا جائے گا۔ ضلعی سطح پر ڈی سی او کا نظام ہو، پولیس کا نظام ہو یا پٹواری اور تحصیلدار کا نظام، تمام کے تمام ریاستی اداروں کا مکمل خاتمہ کر دیا جائے گا۔ اور ان کی جگہ منتخب سوویتوں کے ذریعے سماج کو چلایا جائے گا۔ یہ تمام ادارے عوام کا خون چوسنے کے لیے بنائے جاتے ہیں تاکہ سرمایہ دار طبقے کی عوام پر حکمرانی قائم رہے۔ سوشلسٹ انقلاب کے بعد فوری طور پر ان تمام ریاستی اداروں کا مکمل خاتمہ ناگزیر ہے۔

اس صورتحال میں یہ سوال بھی ابھرتا ہے کہ بحران سے نپٹنے کے لیے کیا یہ ادارے اپنی روش تبدیل کر سکتے ہیں اور کیا یہ ریاست اپنی پالیسی تبدیل کر سکتی ہے؟ گرتی ہوئی معیشت اور پرانتشار سماج پر حکمرانی کرنے والے غلام اور بھکاری بھی کبھی کچھ تبدیل کر پائے ہیں۔ بالکل بھی نہیں۔ یہ حالات کے رحم و کرم پر ہی ہیں اور عالمی سطح پر آنے والے طوفانی واقعات انہیں مزید کمزور کرنے کی جانب بڑھیں گے۔ جس میں متحارب سامراجی قوتوں کی لڑائیاں زیادہ شدت اختیار کریں گی۔ یہ

اس طوفان میں کبھی ایک جانب جھکاؤ بڑھا سکتے ہیں اور کبھی دوسری جانب لیکن اس کے باوجود اپنی کشتی کو ڈوبنے سے نہیں بچا سکتے۔ جس طرح سعودی عرب نے یمن میں اپنی جنگ کے لیے پاکستان کی فوج کو کرائے پر طلب کیا تھا اسی طرح دیگر سامراجی قوتیں بھی مستقبل میں ایسے مطالبات کر سکتیں ہیں۔ خود سعودی عرب اپنے بحران کے باعث مشتعل ہو کر پاکستان کیخلاف کوئی سخت کاروائی کر سکتا ہے۔ پہلے ہی وہ ہندو بنیاد پرست وزیراعظم مودی کو بلا کر اعلیٰ ترین اعزاز سے نواز چکے ہیں۔ اسی طرح چین کی سامراجی گرفت یہاں مضبوط ہوتے ہوئے دیکھ کر امریکی سامراج انتہائی اقدام کرتے ہوئے کسی اتحادی کے ذریعے پاکستانی ریاست کو سبق سکھانے کا آغاز کر سکتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے پاکستانی ریاست پر امریکی پشت پناہی سے چلنے والے عالمی مالیاتی ادارے دیوالیہ پن کا عذاب نازل کر سکتے ہیں جس سے بچانا شاید چین کے لیے ممکن نہ ہو۔ اس کے علاوہ بھی شکست وریخت کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔

لیکن ایک بات واضح ہے کہ پاکستانی ریاست کا مستقبل شدید ترین عدم استحکام اور ٹوٹ پھوٹ پر مبنی ہے۔ امریکہ اور چین کے یہاں پر تضادات کی صورت میں پہلے ہی ریاست مختلف دھڑوں میں تقسیم ہونا شروع ہو گئی ہے۔ امریکہ کا چین کی نسبت ریاستی اداروں میں زیادہ گہرا اثر و رسوخ موجود ہے اور مالیاتی گرفت بھی چین کی نسبت زیادہ ہے۔ اس لیے چین کو یہاں قدم جمانے میں وقت لگے گا۔ لیکن جیسے جیسے یہاں چین کا اثر و رسوخ بڑھے گا ریاست کے تمام اداروں کی دراڑیں بھی واضح ہوتی جائیں گی۔ ریاستی اداروں اور ان کی پراکسیوں کی یہ خانہ جنگی پورے سماج میں انتشار کا باعث بنے گی اور محنت کشوں کو مزید کرب اور تکلیف میں مبتلا کرے گی۔ سامراجی طاقتیں اپنی لڑائی میں آبادی کے بڑے حصے کو شامل کرنے کے لیے مذہب، قوم، رنگ، نسل سمیت ہر تعصب کو استعمال کرنے کی کوشش کریں گی اور اس کے لیے یہاں اپنی پالتو تنظیمیں اور پارٹیاں بنانے کے ساتھ ریاست کے کلیدی شعبوں میں بھی سرمایہ کاری کرتے ہوئے اپنے حامی دھڑے بنانے کی کوشش کریں گی۔ شام، عراق، لیبیا اور دیگر ممالک میں جو عمل ہمیں سطح پر ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے وہ پاکستانی ریاست میں سطح سے نیچے چل رہا ہے۔ عالمی معیشت اور سیاست میں آنے والا کوئی بڑا زلزلہ ان لڑائیوں کو سطح پر لا سکتا ہے اور زیادہ شدید کر سکتا ہے جس سے پاکستان کی کھوکھلی ریاست بھی انہدام کی جانب تیزی سے بڑھ سکتی ہے۔

ایسے میں کچھ بائیں بازو کے دانشور یہ دلیل دیتے ہیں کہ اس وقت کوئی بھی سامراجی طاقت

پاکستانی ریاست کا انہدام نہیں چاہتی اس لیے پاکستانی ریاست منہدم نہیں ہوسکتی۔اس کے علاوہ وہ ماضی سے مثالیں دیتے ہیں کہ کس طرح پاکستانی ریاست مشکل ترین حالات میں بھی اپنے آپ کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئی ہے۔اس کے علاوہ وہ فوراً یہ واویلا بھی کرتے ہیں کہ پاکستان میں کوئی انقلابی صورتحال نہیں اور چونکہ یہاں پہلے جیسی ''غیر انقلابی'' صورتحال ہے اس لیے کچھ بھی نہیں بدلا۔یعنی اگر معروض تبدیل ہوگا تو صرف انقلابی دور میں ہی ہوگا۔یہ سب غیر سائنسی طرزِ فکر اور قنوطیت پسندی کے باعث ہے۔حالات کا تجزیہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس وقت صورتحال ماضی کی نسبت بہت زیادہ مختلف ہے۔سوویت یونین کے انہدام سے پہلے دنیا دو قطبین میں تقسیم تھی جس میں پاکستان امریکی سامراج کے کیمپ میں تھا۔سوویت یونین کے انہدام کے بعد امریکی سامراج کی گرفت یہاں مضبوط ہوئی اور خاص کر 2001ء میں افغانستان پر امریکی حملے سے اس گرفت میں کہیں زیادہ اضافہ ہوا۔لیکن اب صورتحال بہت بڑے پیمانے پر تبدیل ہو چکی ہے۔امریکی سامراج کی گرفت پوری دنیا پر کمزور ہو چکی ہے اور امریکہ اور چین کے علاوہ خطے کی دیگر طاقتیں بھی کھل کر ایک دوسرے کے سامنے آ چکی ہیں اور پاکستان ان کے درمیان ہچکولے کھا رہا ہے۔ایسے میں پاکستان کی ریاست شدید ترین بحران کا شکار ہے اور اس کی شکست و ریخت میں تیزی آئی ہے۔موجودہ صورتحال کا موازنہ اس ریاست کی 70 سالہ تاریخ میں کسی بھی عہد سے نہیں کیا جا سکتا۔خاص طور پر چینی سامراج کا یہاں بڑھتا ہوا تسلط تاریخ میں پہلی دفعہ سامنے آیا ہے۔ہندوستان کی پوری تاریخ ہی سامراجی غلبوں کی تاریخ رہی ہے۔وسطی ایشیا اور عرب سے لے کر برطانیہ، فرانس اور پرتگیز یوں تک مختلف خطوں سے آنے والے حکمرانوں نے یہاں کے عوام کو تاراج کیا ہے لیکن ہمالیہ کے اس پار سے چینی حکمرانوں کا یہاں پر سامراجی غلبہ ایک نیا عمل ہے جسے غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔اس عمل کو درست مارکسی بنیادوں پر ہی سمجھا جا سکتا ہے اور اس کا تجزیہ کرتے ہوئے درست تناظر تخلیق کیا جا سکتا ہے۔دوسرا اس صورتحال کو عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں سے کاٹ کر نہیں دیکھا جا سکتا۔اس حوالے سے واضح ہے کہ پاکستانی ریاست ایک ایسی صورتحال سے دوچار ہے جس کی ماضی میں مثال نہیں ملتی اور اس کے نتائج بھی منفرد ہوں گے۔

لیکن یہ کہنا درست ہے کہ کوئی بھی سامراجی طاقت پاکستانی ریاست کا انہدام نہیں چاہتی اور کسی بھی کیفیت میں اس ریاست کا موجود رہنا ہی ان کے مفادات کے لیے بہتر ہے۔لیکن یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ کسی بھی عمل کے اپنے قوانین ہوتے ہیں اور وہ سامراجی طاقتوں کی خواہشات

کے تابع نہیں ہوتا۔ جس بڑے پیمانے پر بربادی مشرقِ وسطیٰ میں نظر آ رہی ہے اور جو خانہ جنگی کی کیفیت ہے، سامراجی طاقتیں کبھی بھی یہ نہیں چاہتی تھیں گو کہ یہ سب ان کی پالیسیوں کا ہی نتیجہ ہے۔ امریکی سامراج کبھی بھی عراق اور افغانستان میں شکست کا خواہشمند نہیں تھا نہ ہی وہ چین کے اتنے بڑے کردار کی اجازت دینا چاہتا تھا۔ اسی طرح 2008ء کا معاشی بحران تمام سرمایہ دارانہ ریاستوں کی مرضی اور منشا کے خلاف آیا تھا۔ اپنی تمام تر رعونت اور طاقت کے باوجود امریکی ریاست اس بحران کو نہیں روک سکی۔ اسی طرح عالمی تعلقات ہوں یا لیبیا، شام، عراق میں ریاست کا انہدام یہ کسی بھی سامراجی آقا کی مرضی کا پابند نہیں تھا۔ یہی کیفیت پاکستانی ریاست کی ہے۔ اس کا تجزیہ کرتے ہوئے جہاں ہمیں مختلف سامراجی طاقتوں اور یہاں کے حکمرانوں کے عزائم کو مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے وہاں اس عمل اور اس کی سمت کو بھی گہرائی میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ایسے میں واضح نظر آتا ہے کہ اس وقت جو عمل جاری ہے اور جس طرح پاکستانی ریاست خطے میں ہونے والی تبدیلیوں سے جڑ چکی ہے، یہ عمل ریاست کو مضبوط کرنے کی بجائے کھوکھلا کر رہا ہے اور ریاست کے تمام اداروں کو ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار کرتے ہوئے مزید کمزور کرے گا۔

اس دوران پاکستانی ریاست کے اپنے سامراجی عزائم کم ہونے کی بجائے مزید بڑھیں گے۔ افغانستان میں انہیں منہ کی کھانی پڑی ہے جہاں امریکی پشت پناہی سے ہندوستان کا سامراجی غلبہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اب پاکستانی ریاست افغان مہاجرین کو اس شطرنج کی بازی میں پیادے کے طور پر استعمال کر رہی ہے اور اس کے ذریعے افغانستان کو بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہی ہے تاکہ افغانستان کی لوٹ مار میں اس کا حصہ پہلے کی طرح موجود رہے۔ یہ حکمت عملی تضادات کو مزید بھڑکائے گی۔ خود اپنے ملک میں یہ قومی تعصّبات کو مزید بھڑکانے کی کوشش کریں گے اور کسی بھی ممکنہ تحریک سے نپٹنے کے لیے اس قومی تعصب کا ہتھیار تیار کر کے رکھیں گے۔ اسی طرح کشمیر میں ابھرنے والی تحریک سے خوفزدہ ہو کر اسے مذہبی جنون اور انفرادی دہشت گردی کے ذریعے زائل کرنے کی کوشش جاری رکھیں گے۔ اس دوران ریاست کے وہ دھڑے جو دہشت گردوں کے تزویراتی اثاثوں کو پالتے رہے ہیں وہ اپنی آزادانہ حرکت جاری رکھیں گے اور ریاست کے دیگر دھڑوں سے ان کے تضادات موجود رہیں گے۔ ان تزویراتی اثاثوں کو الیکشنوں یا سیاسی سرگرمیوں سے لے کر بیرونی دشمنوں سے حساب بیباک کرنے کے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ صرف پاکستانی ریاست ہی نہیں بلکہ مغربی سامراجی قوتوں کے بھی اثاثے ہیں اور

وہ بھی انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے رہتے ہیں۔

اسی طرح بلوچستان میں قومی آزادی کی تحریک کو خون میں ڈبو دینے کے باوجود وہاں قومی محرومی کے جذبات پہلے کی نسبت زیادہ شدت سے موجود ہیں۔ اس لیے وہاں مستقل بنیادوں پر اپنا غلبہ قائم رکھنا آسان نہیں ہوگا۔ گوادر اور سی پیک کے منصوبے اگر مکمل ہو بھی جاتے ہیں تو بھی وہ تضادات کو ختم کرنے کی بجائے زیادہ شدت سے ابھاریں گے۔ ایسے میں پاکستانی ریاست فاٹا سے لے کر گلگت بلتستان اور کراچی سے لے کر کشمیر تک زوال کا شکار نظر آئے گی۔ اپنی بقا کے لیے یہ عوام پر کسی بھی قسم کا جبر کرنے سے دریغ نہیں کرے گی۔ لیکن ہر جبر اور ظلم اس کو مزید کمزور کرنے کا باعث بنے گا۔ ایسے میں معاشی اور سیاسی بحرانوں کے تازیانے اس زوال کی شدت میں اضافہ کریں گے۔

اس دوران محنت کش طبقے کی ایک ملک گیر تحریک ریاست کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگا سکتی ہے۔ بائیں بازو کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ اگر ان میں سے کسی کے سامنے اس ریاست کے انہدام کا تناظر زیرِ بحث لایا جائے تو اس کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ انہدام تو دور کی بات ہے بلکہ زیادہ تر تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ریاست دن بدن مضبوط ہو رہی ہے۔ حقیقت میں یہ محنت کش طبقے کی طاقت یعنی متبادل 'مزدور ریاست' کے نظریے سے یقین اٹھ جانے اور سیاسی بیگانگی کا شکار ہو کر سماج سے کٹ جانے اور خود اپنی تنظیموں کے کنوؤں میں مینڈکوں کی طرح اچھلتے رہنے کی وجہ سے ہے۔ تاریخی واقعات ایسے لوگوں کا منہ چڑانے کا کوئی موقع بھی ضائع نہیں کریں گے۔ 1968-69ء کی انقلابی تحریک نے پاکستان کی فوج سمیت تمام ریاستی اداروں کو مفلوج کر دیا تھا۔ اور اس سرمایہ دارانہ ریاست کو اکھاڑ کر ایک نئی مزدور ریاست کے قیام کے امکانات روشن ہو گئے تھے۔ ایک انقلابی پارٹی کی عدم موجودگی کے باعث اس ریاست کو اکھاڑا نہیں جا سکا اور آنے والی منتخب حکومت نے اپنی اصلاحات کے ذریعے اسی ریاست کو مضبوط کیا۔ ان اصلاحات کا انجام منتخب وزیرِ اعظم کی پھانسی پر ہوا۔

آج کی نسل کو ان واقعات سے اہم اسباق حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''ریاست اور انقلاب'' میں لینن نے واضح کر دیا تھا کہ سرمایہ دارانہ ریاست کو مکمل طور پر اکھاڑے بغیر سوشلسٹ انقلاب مکمل نہیں ہو سکتا۔ آج کا معروض دوبارہ ایسی صورتحال کی جانب بڑھ رہا ہے اور آنے والے عرصے میں پاکستان کے محنت کش طبقے کو دوبارہ ایسے مواقع ملیں گے۔

ریاست کمزور ہوتے ہوئے اپنے انہدام کی جانب بڑھے گی۔لیکن اس ریاست کو فیصلہ کن انجام تک صرف ایک سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے ہی پہنچایا جا سکتا ہے۔اپنی کمزور ترین کیفیت میں ہونے کے باوجود بھی یہ صفحۂ ہستی پر موجود رہے گی۔جیسا کہ ہمیں عراق یا افغانستان میں نظر آتا ہے۔اس کا مکمل خاتمہ صرف ایک انقلابی پارٹی کی قیادت میں ایک سوشلسٹ انقلاب کر کے ہی کیا جا سکتا ہے جس میں محنت کش طبقہ کلیدی کردار ادا کرے گا۔اس انقلاب کے ذریعے اس ریاست کے بوسیدہ ڈھانچے کا مکمل خاتمہ کر کے پورے سماج کو اس کے تعفن سے نجات دلائی جائے گی۔

3۔دیوالیہ معیشت؟

موجودہ حکومت نے برسر اقتدار آتے ہی آئی ایم ایف کا دروازہ کھٹکھٹایا اور امداد کی بھیک سے اپنی جھولی بھری۔آئی ایم ایف سے نیا قرضہ لینے کا مقصد زرداری حکومت کے آغاز میں لیے گئے قرضے کو واپس کرنا تھا۔ ہر آنے والی نئی حکومت پچھلی حکومت کے لیے گئے قرضوں کو واپس کرنے کے لیے قرضے لیتی ہے۔اسی باعث پاکستان پر قرضوں کا کل حجم تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے اور معیشت ایک ایسے نکتے کی جانب تیزی سے گامزن ہے جہاں قرضوں کے اس بوجھ تلے دب کر مکمل طور پر دیوالیہ ہونے کا اندیشہ لاحق ہے۔عالمی سامراجی مالیاتی ادارے بھی نئے قرضے دے کر اپنے پچھلے قرضوں کی وصولی کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ اس ملک کے محنت کش عوام کی خون پسینے سے پیدا کردہ دولت کا بڑا حصہ بھی اپنی تجوریوں میں بھر لیتے ہیں۔وہ کسی بھی صورت اس ملک کو دیوالیہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے کیونکہ اس صورت میں ان کی تمام تر وصولیاں ڈوب جائیں گی اور انہیں اپنی رقم سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔اس لیے کسی نہ کسی شکل میں اس معیشت کا پہیہ چلائے رکھنے میں ہی ان کا مفاد ہے خواہ اس دوران لاکھوں افراد غربت اور محرومی کے باعث موت کے منہ میں چلے جائیں۔اس کے علاوہ معیشت کو سیاست سے کاٹ کر نہیں دیکھا جا سکتا۔ افغانستان میں امریکی فوجوں کی موجودگی کے باعث امریکی سامراج کو پاکستان کی بیمار معیشت کو بھی امداد کے انجکشن لگانے پڑے اور اس دوران آئی ایم ایف اور دیگر اداروں کی شرائط کو بھی نرم رکھا گیا تاکہ اپنے سامراجی مقاصد کے حصول کے لیے اس ریاست کی گماشتگی کو فعال بنایا جا سکے۔لیکن امریکی فوجوں کے انخلا اور پاکستان کے چین کی جانب بڑھتے ہوئے جھکاؤ کے باعث اس صورتحال میں تبدیلی آ رہی ہے۔

اس سال آئی ایم ایف کے تین سالہ پروگرام کا خاتمہ ہو گیا جس کے مطابق آئی ایم ایف نے 6.1 ارب ڈالر کا قرضہ پاکستان کو قسطوں میں ادا کیا۔اس پروگرام کے خاتمے پر وزیر خزانہ نے بڑھک لگائی کہ آئی ایم ایف سے چھٹکارا حاصل کر لیا گیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اس قرضے سمیت

پچھلے قرضوں کی قسطیں ابھی واپس کرنی ہیں اوران کے لیے عوام پر ٹیکسوں کا مزید بوجھ ڈالا جائے گا۔ اس قرضے کی قسطوں کی فراہمی کے دوران آئی ایم ایف نے پاکستان کی معیشت کے جو تجزیئے کیے وہ سراسر جھوٹ پر مبنی ہیں۔ جہاں ایک طرف پاکستان کی وزارت خزانہ اور دیگر ادارے جھوٹ کے ذریعے معیشت کو ترقی کرتا ہوا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں وہاں آئی ایم ایف کا ادارہ بھی حقائق کو نظر انداز کر کے اپنے لوٹ مار کے مقصد کو اولین ترجیح دیتے ہوئے جھوٹی رپورٹوں کو تسلیم کرتے ہوئے جھوٹے تجزیئے ہی کر رہا ہے۔ اس سے ایک طرف تو یہ واضح ہے کہ آئی ایم ایف اس معیشت کو درست کرنے (بورژوا نقطہ نظر سے) کا ارادہ ہی ترک کر چکا ہے اور کسی بھی صورت اپنی رقم کی وصولی چاہتا ہے۔ دوسرا اس وقت آئی ایم ایف یونان سمیت دیگر ترقی یافتہ مغربی معیشتوں کو دیوالیہ ہونے سے بچانے کی سرتوڑ کوشش کر رہا ہے جبکہ عالمی معیشت ایک بحران کی جانب بڑھ رہی ہے۔ ایسے میں پاکستان جیسی چھوٹی سی معیشت سے زیادہ توقعات وابستہ نہیں کی جاسکتیں۔ اس لیے صرف رسمی کاروائیاں کرتے ہوئے صرف معیشت کے تباہی کی جانب لڑھکنے کا تماشا ہی دیکھا جاسکتا ہے اور اپنی دی ہوئی رقم کی سود سمیت زیادہ سے زیادہ وصولی کو ممکن بنانے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔

6.1 ارب ڈالر کے اس قرضے کو جاری کرتے ہوئے پاکستان کے حکمرانوں کو تنبیہہ کی گئی تھی کہ وہ اپنی میکرو اکانومی کی صورتحال کو بہتر بنائیں گے، معاشی ترقی کو بتدریج بڑھائیں گے اور غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخائر میں اضافہ کریں گے تاکہ بیرونی دھچکوں سے بچا جاسکے۔ آخری قسط کی ادائیگی کے وقت کیے گئے تجزیے میں آئی ایم ایف نے کامیابی کا نعرہ لگایا ہے اور کہا ہے کہ پاکستانی حکمرانوں نے اپنے اہداف پورے کر لیے ہیں جو خود سرمایہ دارانہ پالیسیوں سے ایک مذاق کے سوا کچھ نہیں۔ تجزیے میں کہا گیا ہے کہ ''آئی ایم ایف کے پروگرام کے باعث ملک کی میکرو اکانومی میں استحکام آیا ہے، معاشی حملوں سے بچاؤ کی صلاحیت میں اضافہ ہوا ہے اور سٹرکچرل چیلنجز سے نپٹنے کی صلاحیت بڑھی ہے۔ معاشی ترقی بتدریج بڑھی ہے اور افراط زر کم ہوا ہے۔ بیرونی دھچکوں سے بچاؤ کے لیے طاقت آئی ہے، مالیاتی شعبے کی تاب آوری میں اضافہ ہوا ہے۔ مالیاتی خسارہ کم ہوا ہے اور سوشل سیفٹی کا نیٹ مضبوط ہوا ہے۔'' اصلاحات کے حوالے سے اس رپورٹ میں لکھا ہے، ''ٹیکس پالیسی اور انتظامی اصلاحات کے باعث آمدن میں اضافہ ہوا ہے۔ سٹیٹ بینک آف پاکستان کی خودمختاری کو مضبوط کرنے کے لیے اقدامات کیے گئے ہیں۔ انرجی سیکٹر میں اصلاحات

کے باعث لوڈ شیڈنگ، انرجی پر سبسڈی اور انرجی کے شعبے کے بقایا جات میں کمی ہوئی ہے۔''
اخبار کا باقاعدہ مطالعہ کرنے والا شخص بھی بتا سکتا ہے کہ یہ رپورٹ کس قدر جھوٹ پر مبنی ہے اس کے لیے معاشی ماہر ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسی جھوٹی کارکردگی کی رپورٹ بنا کر وزیرِ خزانہ اپنی کامیابی کا راگ الاپتا پھر رہا ہے اور عوام کو مشورہ دیتا ہے کہ اگر دال نہیں کھا سکتے تو مرغ کھا لیں۔

درحقیقت ملک کی معیشت پہلے سے کئی گنا زیادہ بدتر ہو چکی ہے اور تیزی سے دیوالیہ پن کے دہانے پر پہنچ رہی ہے۔ اسی ملک کے چند بورژوا معاشی ماہرین نے آئی ایم ایف کی رپورٹ اور حکومتی دعوؤں کی قلعی کھول دی ہے اور اسے جھوٹا ثابت کر دیا ہے۔ ڈاکٹر اشفاق حسن خان، حفیظ پاشا اور سلمان شاہ کے آئی ایم ایف کو لکھے گئے مشترکہ خط میں معیشت کے بحران کو عیاں کیا گیا ہے اور حکومتی جھوٹ بے نقاب کر دیے گئے ہیں۔

اس خط کے مطابق آئی ایم ایف کے پروگرام کے مطابق غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخائر کو بڑھانا انتہائی ضروری تھا تاکہ بیرونی معاشی دھچکوں سے بچاؤ کے لیے ایک حفاظتی بند موجود ہو۔ آئی ایم ایف کا خیال تھا کہ ان ذخائر کے بڑھنے سے آئی ایم ایف کے واجب الادا قرضے بآسانی ادا ہو جائیں گے۔ لیکن اس زرمبادلہ کو برآمدات کے ذریعے بڑھانے کی بجائے بڑے پیمانے پر قرضوں سے بڑھایا گیا اور پروگرام کے تین سال کے عرصے میں بیرونی قرضوں کے بوجھ میں 12 ارب ڈالر کا اضافہ ہوا۔ جون 2013ء میں پاکستان کے زرمبادلہ کے ذخائر 6 ارب ڈالر تھے جبکہ جون 2016ء میں یہ 18 ارب ڈالر تک پہنچ گئے۔ ایسے میں واضح نظر آتا ہے کہ یہ 12 ارب ڈالر کہاں سے آئے؟ اسی طرح اس پروگرام کے تین سالہ دور میں آئی ایم ایف نے حکومت کو سولہ جگہوں پر چھوٹ دی جو ماضی میں کبھی بھی نہیں دی گئی۔ اس سے واضح نظر آتا ہے کہ آئی ایم ایف سرمایہ دارانہ بنیادوں پر بھی اپنے اہداف حاصل کرنے میں کتنا سنجیدہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ تین سالوں میں پاکستان نے 25 ارب ڈالر کے بیرونی قرضے لیے جبکہ 3.1 کھرب روپے کے اندرونی قرضے لیے گئے۔ اگر سعودی عرب سے ملنے والی ڈیڑھ ارب ڈالر کی امداد، تیل کی قیمتوں میں ہونے والی کمی اور نجکاری سے ہونے والی آمدن شامل نہ ہوتی تو یہ حجم کہیں زیادہ ہوتا۔ یعنی معیشت کے لیے یہ وقتی بیساکھیاں موجود نہ ہوتیں تو یہ اپنے دم پر چلنے کی بجائے گھٹنوں کے بل پر ہوتی۔ 1947ء کے بٹوارے سے لے کر 1980ء تک ملک پر مجموعی قرضوں کا حجم 155 ارب روپے تھا جو جون 2010ء تک 8911 ارب روپے ہو گیا۔ اس

کے بعد کے حالیہ چھ برسوں میں 11140 ارب روپے کے اضافے کے بعد یہ 20051 ارب روپے ہو چکا ہے۔ یعنی ملک کے قیام کے پہلے 63 برسوں میں جون 2010ء تک 8911 ارب روپے کے قرضے تھے جبکہ گزشتہ چھ سالوں میں 11140 ارب روپے کے قرضے لیے گئے۔ اس میں بیرونی قرضوں کا حجم 30 جون 2016ء تک 72.98 ارب ڈالر تک پہنچ چکا تھا جبکہ اس کے بعد کے مہینوں میں بھی اس میں اضافہ ہوا ہے۔ 30 جون 2016ء کو ختم ہونے والے مالی سال میں بیرونی قرضوں کے حجم میں 7.8 ارب ڈالر کا اضافہ ہوا جو کسی بھی مالی سال میں ہونے والا سب سے بڑا اضافہ تھا۔ 2002ء میں اس ملک میں پیدا ہونے والا ہر بچہ 63 ہزار روپے کا مقروض تھا جبکہ آج آبادی میں اضافے کے باوجود پیدا ہونے والا ہر بچہ ایک لاکھ سات ہزار روپے کا مقروض ہے۔

ملک کے تین بڑے معیشت دانوں، جو اس وقت کسی سرکاری عہدے پر موجود نہیں، کے لکھے گئے خط میں افسوس کا اظہار کیا گیا ہے کہ آئی ایم ایف نے ان تین سالوں میں بہت سے معاشی اشاریوں کی بہتری کی نشاندہی کی ہے۔ ان میں بڑھتی ہوئی معاشی ترقی، گرتا ہوا افراط زر، ٹیکس اور جی ڈی پی کے تناسب میں اضافہ، بینظیر انکم سپورٹ پروگرام کے ذریعے رقوم کی فراہمی اور نجی شعبوں کو دیے جانے والے قرضوں میں اضافہ اور جی ڈی پی میں سبسڈی کی شرح میں کمی شامل ہے۔

معاشی ترقی کے تمام تر اعداد و شمار جھوٹ پر مبنی ہیں۔ ادارۂ شماریات کے اعداد و شمار کے مطابق ان تین سالوں میں جی ڈی پی کا گروتھ ریٹ چار فیصد یا اس سے زیادہ رہا جو 16-2015ء میں 4.7 فیصد ہو گیا۔ خط کے مصنفین کے مطابق یہ جھوٹ پر مبنی ہے اور شرح ترقی 3.1 سے 3.7 فیصد تک رہی۔ لیکن ان بورژوا ماہرین کے اندازوں سے ہٹ کر زیادہ گہرائی میں جائزہ لیا جائے تو تین فیصد کی شرح ترقی بھی مبالغہ آرائی لگتی ہے اور حقیقی شرح ترقی اس سے کہیں زیادہ کم ہے۔ آئی ایم ایف کی ایم ڈی کے یکم ستمبر 2016ء کے ایک بیان میں صورتحال زیادہ واضح ہو جاتی ہے، اس کے مطابق، ''لمبے عرصے کی طلب میں کمزوری برقرار ہے جس کے باعث لمبے عرصے کی ترقی خدشات کا شکار ہے۔ فرموں نے پیداواری صلاحیت میں کمی کی ہے اور بیروزگار ورکر لیبر فورس کو ہی ترک کر رہے ہیں جبکہ اہم ہنر ختم ہو رہے ہیں۔ کمزور طلب سے تجارت بھی کم ہوتی ہے جس کے باعث پیداواریت کی نمو کی مایوسی میں اضافہ ہوتا ہے۔''

اس بیان سے ہی واضح نظر آتا ہے کہ معاشی ترقی کی کیا صورتحال ہے۔ کم تر معاشی ترقی کے باعث روزگار کے مواقع پیدا نہیں کیے جا سکے۔ ایک لمبے عرصہ تک روزگار نہ ہونے کے باعث بہت بڑی تعداد میں افراد سماجی انتشار کا حصہ بن جاتے ہیں اور جرائم یا منشیات کی جانب رخ کرتے ہیں۔ اس کے سماجی اور معاشی اثرات اپنی جگہ موجود ہیں۔ اس وقت سرکاری سطح پر بیروزگاری کی شرح آٹھ فیصد بیان کی جاتی ہے جو حقیقت سے کہیں زیادہ کم ہے۔ ایک اندازے کے مطابق حقیقی بیروزگاری کی شرح پچاس فیصد کے قریب ہے۔ لیکن اگر آٹھ فیصد کو بھی تسلیم کر لیا جائے تو یہ گزشتہ تیرہ سالوں میں سب سے زیادہ ہے جبکہ نوجوانوں میں بیروزگاری کی شرح سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 15-2014ء میں 11 فیصد تک پہنچ چکی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ 13-2008ء کے دوران تیرہ لاکھ لوگ سالانہ محنت کی منڈی میں شامل ہو رہے تھے جبکہ 15-2012ء تک ساڑھے چھ لاکھ سالانہ اس منڈی میں شامل ہو رہے تھے جو روزگار ملنے سے مایوسی کا واضح اظہار ہے۔ اس کے علاوہ بی اے اور ایم اے کی ڈگری رکھنے والے بیس فیصد افراد بیروزگار ہیں۔ اس وقت ملک میں 24 لاکھ ایسے پڑھے لکھے افراد موجود ہیں جنہیں بہتر روزگار کی کوئی امید نہیں۔ 15-2013ء میں سالانہ ساڑھے سات لاکھ روزگار پیدا ہوا جبکہ اس سے قبل 11 لاکھ روزگار سالانہ پیدا کیے جا رہے تھے۔ یہ آئی ایم ایف کے پروگرام کا نتیجہ ہے۔

مالیاتی خسارے کے حوالے سے کہا جا رہا ہے کہ اسے جی ڈی پی کے 8.5 فیصد سے کم کر کے 4.5 فیصد کر دیا گیا ہے۔ یہ اعداد و شمار بھی جھوٹ پر مبنی ہیں اور مختلف قسم کی چالاکیوں کے ذریعے اسے مرتب کیا گیا ہے۔ نجکاری سے ہونے والی آمدن اور بیرونی ممالک سے ملنے والی گرانٹس کو بھی آمدن میں ظاہر کیا گیا ہے جو کہ عمومی طور پر نہیں کیا جاتا بلکہ انہیں فنانسنگ کے لیے الگ سے ظاہر کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح کچھ کمرشل اداروں سے ایڈوانس میں ٹیکس لے کر اور کچھ ادائیگیوں میں تاخیر کر کے اس اعداد و شمار کے جھوٹ کو بُنا گیا ہے۔ مالیاتی خسارے کو کم ظاہر کرنے کے لیے اخراجات میں کمی ثابت کرنے کے لیے اعداد و شمار کا ہیر پھیر کیا گیا ہے جو گزشتہ تین سالوں میں 600 ارب روپے تک پہنچ گیا ہے۔ اسی طرح صوبائی کیش سرپلس میں مبالغہ آرائی کی گئی ہے، جبکہ بہت سی ادائیگیوں میں تاخیر کی گئی ہے جس میں پاور سیکٹر کو 1400 ارب روپے کی ادائیگیاں شامل ہیں۔ اگر اس تمام ہیرا پھیری کو سیدھا کیا جائے تو مالیاتی خسارہ ابھی بھی جی ڈی پی کے 7 سے 8 فیصد تک موجود ہے جو حکومتی دعوؤں کے جھوٹ کو واضح کرتا ہے۔

اسی طرح ایک اور جھوٹ افراط زر کی شرح میں کمی کا ہے جو 13-2012ء میں 7.4 فیصد تھی اور اب 16-2015ء میں 2.9 فیصد ظاہر کیا جا رہا ہے۔ باقی تمام اعداد و شمار کی طرح اس پر بھی یقین نہیں کیا جا سکتا اور حقیقی افراط زر اس سے کہیں زیادہ ہے۔ لیکن دوسری جانب افراط زر میں اگر کمی ہوئی ہے وہ حکومتی پالیسیوں کا نتیجہ نہیں بلکہ عالمی سطح پر تیل اور دیگر اجناس کی قیمتوں میں کمی کے باعث ہے۔ پاکستان میں بھی عوامی دباؤ کے باعث تیل کی قیمتوں میں خاطر خواہ کمی ہوئی ہے گو کہ اس دوران تیل پر لگائے جانے والے ٹیکسوں میں بڑے پیمانے اضافہ کیا گیا ہے۔ تیل کی قیمتوں میں کمی کے باعث افراط زر میں کسی حد تک کمی دیکھنے میں آئی ہے۔ لیکن اس دوران اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں میں تیز ترین اضافہ دیکھنے میں آیا ہے جو اجرتوں میں اضافے سے کہیں زیادہ ہے۔ پاکستان میں اس وقت آبادی کا بڑا حصہ غذا کی قلت کا شکار ہے۔ ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق غذائی قلت کے اعتبار سے دنیا کے 118 ممالک میں پاکستان 107 ویں نمبر پر ہے یہاں تک کہ بنگلہ دیش سے بھی نیچے ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہاں غذائی اجناس کی قلت ہے بلکہ آبادی کی اکثریت کے پاس مکمل غذا خریدنے کی مالی سکت نہیں۔ حکمرانوں کی مالیاتی پالیسیوں کے یہی ہولناک نتائج ہیں جو عوام کی ہڈیوں میں سرایت کر چکی ہیں۔ عوام کی قوت خرید میں کمی بھی افراط زر میں کمی کی ایک بڑی وجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سارے عرصے میں سٹیٹ بینک کی مانیٹری پالیسی کا رجحان افراط زر میں کمی نہیں بلکہ اضافے کی جانب تھا جب شرح سود ملک کی تاریخ کی کم ترین سطح پر ہے۔ لیکن اس کے باوجود افراط زر میں کمی ہونا ظاہر کرتا ہے کہ یہ حکومتی پالیسیوں کے باعث نہیں بلکہ دیگر وجوہات کے باعث تھا۔

اسی طرح پاکستان کی برآمدات میں بڑے پیمانے پر کمی ہوئی ہے۔ موجودہ حکومت کے آغاز پر تخمینہ لگایا گیا تھا کہ سالانہ 8 فیصد کی شرح ترقی سے اسے 16-2015ء تک 30 ارب ڈالر تک پہنچایا جائے گا جبکہ گزشتہ سال یہ 22 ارب ڈالر سے بھی کم پر تھی جو 23 فیصد کمی ہے۔ اور اس سال اس میں مزید کمی ہو چکی ہے۔ بیرونی قرضوں اور برآمدات کا تناسب 13-2012ء میں 193 فیصد سے بڑھ کر 16-2015ء میں 266 فیصد ہو چکا ہے۔ 18-2017ء میں یہ 300 فیصد کے تناسب تک پہنچ جائے گی۔ اس سے واضح نظر آتا ہے کہ جہاں بیرونی قرضے بڑھ رہے ہیں وہاں برآمدات میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ دوسرا قرضوں کے ذریعے بنائے گئے زرمبادلہ کے ذخائر برآمدات پر منفی اثرات مرتب کر رہے ہیں جسے بورژوا معیشت میں

''Dutch Disease'' کہا جاتا ہے۔ان ذخائر کے نتیجے میں پاکستانی کرنسی کی قدر کو مستحکم رکھا گیا ہے جو حقیقی قدر سے زائد ہے، اس کے باعث برآمدات متاثر ہوئی ہیں۔ برآمدات میں اضافے کے لیے کرنسی کی قدر میں کمی کرنی پڑے گی لیکن اس سے پھر قرضوں کے بوجھ میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔اسی طرح گزشتہ تین سالوں میں بجلی کی قیمتوں میں 40 فیصد جبکہ صنعتوں کے لیے گیس کی قیمتوں میں 64 فیصد اضافہ کیا گیا ہے جس کی وجہ سے لاگت میں اضافہ ہوا ہے۔ لوڈشیڈنگ کا عذاب اس کے علاوہ ہے جس کے باعث بہت سی صنعتیں بند ہو چکی ہیں۔اس کے علاوہ امریکہ اور یورپ میں معاشی بحران کے باعث بھی طلب میں کمی ہوئی ہے اور برآمدات میں کمی دیکھنے میں آئی ہے۔گزشتہ تین سالوں میں برآمدات سے ہونے والی آمدن میں 20 فیصد کی مجموعی کمی ہو چکی ہے جو 13-2012ء میں 25.1 ارب ڈالر سے کم ہو کر 16-2015ء میں 20.8 ارب ڈالر ہو گئی تھیں۔موجودہ مالی سال کی پہلی سہ ماہی میں ٹیکسٹائل کی برآمدات میں 6 فیصد جبکہ دیگر برآمدات میں 14 فیصد کمی ہوئی ہے۔آنے والے عرصے میں اس میں اضافے کا کوئی امکان نہیں اور پاکستان کا مالیاتی خسارہ مسلسل بڑھتا چلا جائے گا۔

آئی ایم ایف کی رپورٹ میں برآمدات کی کمی کو بھی نظر انداز کیا گیا ہے جبکہ خاص طور پر برآمدات اور جی ڈی پی کے تناسب میں خاطر خواہ کمی دیکھنے میں آئی ہے۔اس کے علاوہ نجی سرمایہ کاری اور جی ڈی پی کے تناسب میں بھی کمی آئی ہے، براہ راست غیر ملکی سرمایہ کاری FDI میں کمی آئی ہے، بیرونی قرضوں اور کُل قرضوں کے جی ڈی پی کے تناسب میں اضافہ ہوا ہے، جی ڈی پی کے تناسب سے ترقیاتی اور انفراسٹرکچر کے لیے غریب پرور اخراجات میں کمی آئی ہے۔اس کے علاوہ بیروزگاری خاص کر نوجوانوں، تعلیم یافتہ اور خواتین کی بیروزگاری میں اضافہ ہوا ہے۔ملک میں بیروزگاری کے باعث بڑی تعداد میں محنت کش بہتر معیار زندگی اور روزگار کی تلاش میں بیرون ملک جانے پر مجبور ہوئے ہیں۔اسی وجہ سے ان ممالک سے پاکستان بھیجی جانے والی رقوم میں اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ یہ رقم 08-2007ء میں 6.5 ارب ڈالر سے بڑھ کر 16-2015ء میں 19.9 ارب ڈالر تک پہنچ چکی تھی۔اس کی ایک وجہ 2009ء میں رقوم کی ترسیل کے قوانین میں کی جانے والی تبدیلیاں بھی تھیں۔ یہ ترسیلات اس عرصے میں معیشت کا اہم ستون بن چکی ہیں۔غیر قانونی ذرائع سے آنے والی رقوم اس کے علاوہ ہیں جو ملک میں معاشی سائیکل کے جاری رکھنے میں اہمیت کی حامل ہیں۔لیکن عالمی سطح اور خاص کر سعودی عرب میں معاشی بحران کے

باعث ان میں کمی کا آغاز ہو چکا ہے۔ بریگزٹ کے بعد پاؤنڈ کی قدر میں کمی اور بحران کے باعث وہاں سے آنے والی رقوم میں 38 فیصد کمی دیکھنے میں آئی۔ جولائی سے ستمبر کی سہ ماہی میں گزشتہ سال کی نسبت بیرونی ممالک سے آنے والی رقوم میں 5.39 فیصد کم ہوکر 4.698 ارب ڈالر رہ گئی ہیں۔

موجودہ حکومت کی ایک بڑی ناکامی پاور سیکٹر میں آئی ایم ایف کی تجویز کردہ سرمایہ دارانہ اصلاحات میں بڑے پیمانے پر ناکامی ہے۔ جبکہ آئی ایم ایف نے اپنی رپورٹ میں حکومت کی کارکردگی کو سراہا ہے کہ اس نے پاور سیکٹر کو دی جانے والی سبسڈی 13-2012ء میں جی ڈی پی کے 2 فیصد سے کم کر کے 16-2015ء میں 0.6 فیصد کر دی ہے۔ لیکن یہ کیسے کیا گیا؟ اس کے لیے لائن لاسز میں کمی نہیں کی گئی۔ بلکہ بجلی کی قیمتوں میں اضافہ کیا گیا تا کہ سبسڈی کے خاتمے سے ہونے والے فرق کو پورا کیا جا سکے۔ 13-2012ء سے 16-2015ء تک بجلی کی قیمت میں (سرچارجوں سمیت) 40 فیصد تک اضافہ کیا گیا جس کے باعث پاور کمپنیوں کی آمدن میں 250 ارب روپے کا اضافہ ہوا۔ یہ اضافہ اس وقت کیا گیا جب تیل کی قیمت میں 49 فیصد کمی ہوئی۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ان کمپنیوں کو ادا کیے جانے والے واجبات میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ اس وقت اس شعبے کا گردشی قرضہ 630 ارب روپے پر پہنچ چکا ہے جو جی ڈی پی کے 2 فیصد سے زیادہ ہے۔ بجلی کی سپلائی میں معطّلی سے بچنے کے لیے اس قرضے کو جلد ادا کرنا ہو گا جیسا کہ 13-2012ء میں کیا گیا تھا۔ اس ادائیگی کے بعد مالیاتی خسارے میں نام نہاد کمی بھی اصل جگہ پر آ جائے گی۔ حکومت کے ایما پر آئی ایم ایف نے یہ بھی کہا ہے کہ صنعتوں میں لوڈ شیڈنگ میں کمی آئی ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ صنعتوں کی بجلی کی طلب میں ہی کمی آ چکی ہے۔ نیپرا کے مطابق دس پاور کمپنیوں میں سے نو کمپنیوں میں اگر لوڈ شیڈنگ سے پہلے والے عرصے سے موازنہ کیا جائے تو اوسطاً ہر صنعتی صارف کی بجلی کی کھپت میں کمی آئی ہے۔

اس کے علاوہ آئی ایم ایف نے ٹیکس اور جی ڈی پی کے تناسب میں دو فیصد اضافے کو بھی سراہا ہے اور اسے اپنی کامیابی گردانا ہے۔ اس اضافے کا بڑا حصہ 16-2015ء میں دیکھنے میں آیا۔ یہ اضافہ بھی بڑے مگرمچھوں پر ٹیکس لگا کر یا نئے افراد کو ٹیکس نیٹ میں شامل کر کے حاصل نہیں کیا گیا بلکہ موجودہ ٹیکسوں میں اضافے سے حاصل کیا گیا ہے۔ اسی طرح آمدن کے بہت سے ذرائع جو

پہلے ٹیکس کی مد میں شامل نہیں تھے انہیں ''دیگر ٹیکسوں'' کے نام سے ٹیکس کی مد میں شامل کر کے یہ اضافہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اس طرح FBR کے ٹیکس اور جی ڈی پی کے تناسب کے اضافے کو مصنوعی طور پر بڑھایا گیا ہے۔ اس حوالے سے کوئی بھی سنجیدہ معاشی ماہر ٹیکس اور جی ڈی پی کے موجودہ اعداد و شمار کا موازنہ پہلے والے اعداد و شمار سے نہیں کرے گا۔ کیونکہ ٹیکس کی وصولی کی مد کو ہی تبدیل کر دیا گیا ہے۔ پہلے والے سے موازنہ کرنے کے لیے ان نئی مدوں کو پچھلے سالوں کی آمدن میں بھی ظاہر کرنا پڑے گا تب ہی ان سالوں کے ٹیکس اور جی ڈی پی کی شرح کو جانا جا سکتا ہے۔ اور پھر اضافے کو جانچا جائے گا۔ یہ ہیرا پھیری وقتی طور پر تو وزیر خزانہ کی گردن کو اکڑا سکتی ہے لیکن ملک کے تمام تر معاشی ڈھانچے کو تباہ کرنے کا باعث بن رہی ہے۔ اسی طرح پاکستان کی کمزور ریاست اور بدعنوان حکمران اس قابل نہیں کہ بڑے سرمایہ داروں پر ٹیکس لگا سکیں یا بڑی کمپنیوں پر ٹیکسوں میں اضافہ کر سکیں۔ پاکستان امیر افراد سے ٹیکس لینے والے ممالک کی فہرست میں آخری نمبروں پر آتا ہے اور اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بالواسطہ ٹیکس لگائے جاتے ہیں جس میں غریب عوام پر ٹیکسوں کو بوجھ مسلسل بڑھایا جاتا ہے۔ بجلی کے بلوں سے لے کر ماچس کی ڈبی تک ہر شے پر ٹیکس لگایا جاتا ہے جبکہ دولت، آمدن اور پراپرٹی پر ٹیکسوں کی شرح انتہائی کم ہے۔ پاکستان میں نجی کمپنیوں کے منافعوں، زرعی آمدن اور دیگر آمدنوں پر ٹیکس انتہائی کم ہے یا بالکل بھی نہیں۔

آئی ایم ایف کے دعووں کے برعکس ان تین سالوں میں پاکستان میں معیار زندگی میں گراوٹ آئی ہے اور غربت اور بیروزگاری میں اضافہ ہوا ہے۔ کھاد اور بجلی کی قیمتوں میں اضافے سے غذائی اجناس کی قیمتوں میں اضافہ ہوا ہے جس سے غریب افراد شدید متاثر ہوئے ہیں۔ اسی طرح مالیاتی خسارے کو کم کرنے کے لیے ترقیاتی اخراجات میں 30 فیصد کمی کی گئی ہے جس سے معیار زندگی پر اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ صرف 16-2015ء میں اس کمی کے باعث تین لاکھ روزگار پیدا نہیں کیے جا سکے۔ اس کے علاوہ بالواسطہ ٹیکسوں میں اضافے سے معیار زندگی شدید متاثر ہوا ہے۔ اس میں غذائی اجناس کی درآمد پر ٹیکس میں اضافہ اور تیل کی مصنوعات خاص طور پر ڈیزل پر جی ایس ٹی میں اضافہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ برآمدات میں کمی کے باعث ٹیکسٹائل اور دیگر درمیانی اور چھوٹی صنعتوں میں روزگار کی فراہمی میں کمی آئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ صوبائی حکومتوں کی جانب سے سماجی شعبوں میں اخراجات میں کمی کے باعث بھی معیار زندگی میں گراوٹ

آئی ہے۔صوبائی حکومتیں دباؤ کا شکار ہیں کہ بڑے پیمانے پر کیش کی موجودگی (کیش سرپلس) کو یقینی بنائیں اس لیے انہوں نے سماجی شعبوں میں اخراجات میں کمی کی ہے۔

اس حکومت کے آغاز پر تخمینہ لگایا گیا تھا کہ 17-2016ء تک بیرونی قرضوں کی ادائیگی اور کرنٹ اکاؤنٹ خسارے کے لیے درکار فنانسنگ کو 9.2 ارب ڈالر سالانہ تک لایا جائے گا۔جبکہ 18-2017ء تک اسے مزید کم کر کے 8 ارب ڈالر کیا جائے گا۔لیکن بیرونی قرضوں کے بوجھ میں خاطر خواہ اضافے کے باعث 17-2016ء میں فنانسنگ کے لیے 10.2 ارب ڈالر درکار ہیں جبکہ 18-2017ء میں یہ رقوم 13.2 ارب ڈالر تک بڑھ جائیں گی۔لیکن اس اندازے میں برآمدات اور غیر ممالک میں رہنے والے تارکین وطن کی بھیجی جانے والی رقوم میں بڑا اضافہ شامل کیا گیا ہے۔موجودہ صورتحال کو دیکھ کر یہ واضح ہے کہ ایسا ممکن نہیں۔اگر اس فنانسنگ کو حقیقی بنیادوں پر دیکھیں تو بورژوا ماہرین 17-2016ء میں 15 ارب ڈالر 18-2017ء میں 18 ارب ڈالر کا تخمینہ لگا رہے ہیں۔یہ جی ڈی پی کے 5 فیصد سے زیادہ بنتا ہے۔اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخائر میں بھی خاطر خواہ کمی آئے گی۔اس بات کا غالب امکان ہے کہ جون 2018ء تک یہ ذخائر موجودہ سطح کے نصف تک پہنچ جائیں۔اس حوالے سے پاکستان کی معیشت کی حالت انتہائی مخدوش ہے۔آئی ایم ایف کی آخری قسط وصول کرنے کے صرف دو ہفتے بعد پاکستان کو عالمی منڈی میں انتہائی بلند شرح سود پر ایک ارب ڈالر کے بانڈ فروخت کرنے پڑے۔یہ معیشت کی دگرگوں صورتحال واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔

گزشتہ تین سالوں کی معاشی پالیسیوں کے بعد زرعی ترقی منفی میں جا چکی ہے اور اس سال کی کپاس کی فصل کے امکانات بھی زیادہ بہتر نہیں۔بڑے پیمانے کی مینوفیکچرنگ کی ترقی بھی منفی میں ہے۔بارہ میں سے سات بڑے صنعتی گروپ پیداوار میں کمی کا شکار ہیں۔برآمدات میں کمی جاری ہے اور تجارتی خسارہ بڑھ رہا ہے۔مالی سال 2016ء کے اختتام پر تجارتی خسارہ 8.14 فیصد بڑھ کر 23.96 ارب ڈالر تک پہنچ چکا تھا۔جبکہ موجودہ مالی سال کے پہلے دو ماہ میں گزشتہ سال کے مقابلے میں اس میں 27.3 فیصد اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔پہلے دو ماہ میں یہ گزشتہ سال سے 1.1 ارب ڈالر اضافے کے ساتھ 4.8 ارب ڈالر ہو چکا ہے۔تارکین وطن کی رقوم اور غیر ملکی سرمایہ کاری میں کمی کا رجحان ہے اور موجودہ مالی سال کے پہلے دو ماہ میں اس میں 3.1 فیصد کمی ہوئی ہے۔ایف بی آر کی ٹیکسوں کی آمدن گر چکی ہے اور حکومت سٹیٹ بینک سے بڑے قرضے لے

رہی ہے۔ واجبات کی ادائیگی کا بوجھ بڑھتا جا رہا ہے جس کے باعث اہم سرکاری اداروں کو مزید نچوڑ کر تباہ کیا جا رہا ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ آئی ایم ایف کی پالیسی اپنانے کے باوجود معیشت کو مستحکم نہیں کیا جا سکا۔ اس کے لیے آئی ایم ایف کے نئے پروگرام کی ضرورت پڑے گی جس میں پہلے سے زیادہ سخت شرائط موجود ہوں گی۔ پہلے ہی قرضے حاصل کرنے کے لیے موٹروے، پاکستان ٹیلی وژن اور ریڈیو کی تمام عمارتوں کو گروی رکھ دیا گیا ہے۔ نئے قرضوں کا نتیجہ بھی پہلے سے زیادہ بدحالی کی صورت میں ہی نکلے گا۔

بینک

پاکستان میں اس وقت سب سے زیادہ منافع خور شعبہ بینکوں کا ہے۔ وزیرِ خزانہ کے مطابق ملک کا مالیاتی شعبہ مضبوط ہوا ہے جبکہ درحقیقت اس کی لوٹ مار میں اضافہ ہوا ہے اور حکمرانوں کی ملی بھگت سے غریب کھاتہ داروں کو لوٹنے سے لے کر سرکار کو دیے جانے والے قرضوں تک ہر طریقے سے کھلی لوٹ مار کی جا رہی ہے۔ 2013ء میں بینکوں کا ٹیکس سے قبل مجموعی منافع 162 ارب روپے تھا جو 2015ء میں 329 ارب روپے ہو گیا۔ اتنے کم عرصے میں ایک ترقی پذیر ملک میں بینکوں کے منافعوں میں اتنے بڑے اضافے کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ پاکستان میں بینکوں کے کھاتوں کا ایک بڑا حصہ نفع ونقصان میں شراکت کی بنیاد پر ہیں (Profit Loss Sharing)۔ اس کے مطابق بینک اپنے کھاتہ داروں کو اس منافع کا حصہ دینے کے پابند ہیں لیکن اس معاہدے کی کھلی خلاف ورزی کی جا رہی ہے۔ 27 ستمبر 2013ء کو سٹیٹ بینک کی جانب سے احکامات جاری کیے گئے کہ بینک کھاتے داروں کو دی جانے والی کم سے کم شرح منافع کو شرح سود سے منسلک کر دیں۔ اس کے باعث بینکوں کو موقع ملا کے وہ کھاتہ داروں کو ان منافعوں میں حصہ دینے سے محروم کر دیں۔ ماہر معیشت شاہد حسن صدیقی 25 اگست کو روزنامہ جنگ میں لکھتے ہیں کہ، ''2013ء میں بینکوں کا ٹیکس سے قبل منافع 162 ارب روپے تھا اور انہوں نے اپنے بچت کھاتے داروں کو تقریباً 6.5 فیصد سالانہ کا منافع دیا۔ 2015ء میں بینکوں کا یہ منافع 329 ارب روپے ہو گیا مگر بچت کھاتے داروں کو صرف تقریباً 5 فیصد سالانہ منافع دیا گیا۔ جولائی 2016ء میں یہ شرح مزید گر کر تقریباً 3.75 فیصد ہو گئی۔ یہ بات روز روشن کی طرح

عیاں ہے کہ بینک نفع ونقصان میں شراکت کی بنیاد پر کھولے گئے کھاتوں پر دی جانے والی شرح منافع کم کر کے اپنا منافع بڑھا رہے ہیں اور کھاتے داروں کا استحصال کر رہے ہیں۔''

''اس وقت ملک میں کام کرنے والے پانچ بڑے بینکوں کا بینکاری کی صنعت کے مجموعی منافع میں حصہ 60 فیصد ہے۔ جب یہ بینک حکومتی شعبے میں کام کر رہے تھے اس وقت بینک کے کھاتے داروں کا اتنے بڑے پیمانے پر استحصال اور حکومت کو بجٹ خسارے کو پورا کرنے کے لیے اتنے بڑے پیمانے پر قرضے فراہم کرنے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔''

اس سے واضح ہوتا ہے کہ بینکوں کی نجکاری سے ملک کا مالیاتی شعبہ کمزور ہوا ہے اور کھاتے داروں کا استحصال بڑھا ہے۔ بینکوں کی ان منافع خور پالیسیوں کے باعث ملک میں بچتوں کے رجحان میں کمی آئی ہے اور یہ پراپرٹی کے کاروبار کی جانب رجحان کی بھی ایک وجہ بنی ہے جس کے باعث ملک میں غیر پیداواری سرمایہ کاری میں اضافہ ہوا ہے۔ مالی سال 2004ء میں جی ڈی پی کے تناسب سے داخلی بچتوں کی شرح 15.7 فیصد تھی جو مالی سال 2016ء میں کم ہو کر صرف 8.2 فیصد رہ گئی ہے۔ جبکہ اس دوران پراپرٹی کا بلبلہ بہت زیادہ پھول چکا ہے۔

بینکوں کے بڑھتے منافعوں کی ایک بڑی وجہ بینکوں میں نجکاری کے بعد یونینوں کے خاتمے کے باعث بینک ملازمین کے استحصال میں بڑا اضافہ ہے جسے بورژوا معیشت دان نظر انداز کرتے ہیں۔ نجکاری سے قبل بینک ملازمین کا معیار زندگی اب کی نسبت بہت زیادہ بہتر تھا اور اجرتوں اور کام کے اوقات کار بہت بہتر تھے۔ نجکاری کے بعد بڑے پیمانے پر ملازمین کو نوکریوں سے نکالا گیا ہے اور کئی ملازمین کا کام ایک ملازم سے لیا جاتا ہے۔ بہت سے شعبے ٹھیکے پر دے دیے گئے ہیں اور مستقل ملازمین کا تناسب انتہائی کم کر دیا گیا ہے۔ ٹھیکے پر کام کرنے والے ملازمین کی اجرتیں اور مراعات پہلے کی نسبت کئی گنا کم ہیں جس کے باعث بینک انتہائی کم اجرتوں پر انتہائی زیادہ کام لے رہے ہیں۔ اسی طرح کام کے اوقات کار میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ پہلے دو بجے خدمات کے لیے بینک بند ہو جاتے تھے جبکہ اب پانچ بجے تک کھلے رہتے ہیں۔ یعنی تین گھنٹے روزانہ کام کے اوقات کار میں اضافہ ہوا ہے جبکہ اجرتیں افراط زر کے تناسب سے کم ہوئی ہیں۔ اس حوالے سے ملازمین کے استحصال میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے جو بینکوں کے اتنے بڑے منافعوں کا باعث بنا ہے۔ بینکوں کے ملازمین کو اپنے حقوق کے دفاع کے لیے منظّم ہونے کی ضرورت ہے۔ مضبوط یونینیں نہ صرف ملازمین کے استحصال کو کم کروا سکتی ہیں بلکہ بینکوں کے کھاتے داروں کے منافعوں

میں کٹوتیوں میں بھی رخنہ پیدا کرسکتی ہیں۔بینکوں میں یونینوں کے خاتمے سے بینک مالکان کی دولت میں تو کئی گنا اضافہ ہوا ہے لیکن خود سرمایہ دارانہ بنیادوں پر مالیاتی شعبہ کمزور ہوا ہے جو ملکی معیشت کی بنیادوں کو مزید کمزور کرنے کا باعث بن رہا ہے۔

بینکوں کے منافعوں میں اتنے بڑے اضافے کے باوجود ملکی صنعت وتجارت میں بڑا اضافہ دیکھنے میں نہیں آیا بلکہ صنعتی پیداوار میں کمی ہورہی ہے۔درحقیقت جس دوران بینکوں کے منافعوں میں اتنی تیزی ترین بڑھوتری نظر آتی ہے اسی دوران صنعتوں کی بندش میں اضافہ اور برآمدات میں بھی بڑے پیمانے پر کمی آتی ہے۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس وقت بینکوں کی کُل سرمایہ کاری کا بڑا حصہ حکومت کو دیے جانے والے قرضے ہیں جبکہ نجی شعبے کو دیے جانے والے قرضوں میں خاطر خواہ کمی آئی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ نجی شعبوں کو دیے جانے والے قرضوں کی شرح ترقی منفی میں جا رہی ہے۔موجودہ مالی سال کی پہلی سہ ماہی میں نجی شعبوں کو دیے جانے والے قرضے منفی 141 ارب ہیں جو گزشتہ سال کی پہلی سہ ماہی میں منفی 66 ارب روپے تھے۔یعنی نجی شعبے میں نئے قرضوں کا حصول انتہائی کم ہے جبکہ حکومت کو دیے جانے والے قرضے بڑھے ہیں۔پہلی سہ ماہی میں اکتوبر کے پہلے ہفتے کو شامل کر کے حکومت کے لیے جانے والے قرضے 391 ارب روپے ہیں جبکہ اسی مدت کے دوران گزشتہ سال 191 ارب روپے کے قرضے لیے گئے۔اس سرمایہ کاری کا مقصد یہ ہے کہ حکومت بجٹ خسارہ پورا کرنا چاہتی ہے۔تجارتی بینک صنعت، زراعت اور مائیکرو فنانس وغیرہ کے قرضوں میں دلچسپی نہیں لے رہے اور کوئی بڑا خطرہ مول لیے بغیر ٹریژری بلز اور پاکستان انویسٹمنٹ بانڈز میں سرمایہ کاری کررہے ہیں۔اس کی وجہ سے ملک کی شرح نمو سست ہورہی ہے اور بیروزگاری میں بھی اضافہ ہورہا ہے۔یعنی بینک اپنے اصل کام کی بجائے حکومت کے خسارے پورے کرنے پر لگے ہوئے ہیں جو سرمایہ دارانہ بنیادوں پر چلنے والی معیشت کے لیے زہر ہے۔اسٹیٹ بینک کی ایک رپورٹ کے مطابق اس مالی سال میں مانیٹری پھیلاؤ میں کمی آئی ہے اور یہ گزشتہ سال کی نسبت ایک تہائی ہو چکا ہے۔ 17-2016ء کی پہلی سہ ماہی میں یہ پھیلاؤ 0.12 فیصد یا 15 ارب روپے تھا جبکہ گزشتہ سال اس سہ ماہی میں یہ 45 ارب روپے تھا۔جی ڈی پی میں شرح ترقی کی اہم بنیاد یہی پھیلاؤ رہا ہے جس میں بڑی کمی دیکھنے میں آ رہی ہے یعنی معیشت کو ترقی کے لیے درکار زر (Liquidity) فراہم نہیں ہو پا رہی۔لیکن اس کے باوجود بینک اپنی پالیسی تبدیل کرنے کی بجائے حکومت کو قرضوں کی فراہمی کے سلسلے کو نہ

صرف جاری رکھے ہوئے ہیں بلکہ اس میں اضافہ کررہے ہیں۔

بینکوں کی بڑھتی ہوئی بدعنوانی کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ 2010ء سے 2015ء کے پانچ سالوں میں تقریباً 8 ارب ڈالر فارن کرنسی اکاؤنٹس کے ذریعے ملک سے باہر منتقل کیا گیا۔ قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی برائے فنانس میں اسٹیٹ بینک کی اس حالیہ رپورٹ کے مطابق ان میں سے صرف 600 ملین ڈالر سرمایہ کاری کی غرض سے منتقل ہوا۔ ملک کے بدعنوان حکمرانوں کے باعث مالیاتی شعبے میں ایسے طریقوں یا قوانین کو نظر انداز کرتے ہوئے پیسہ ملک سے باہر محفوظ مقامات پر منتقل کیا جاتا ہے۔ یہ پیسہ بظاہر قانونی طریقے سے منتقل ہوا ہے گو کہ ''فنانشل مانیٹرنگ یونٹ'' کو اس کی خبر نہیں دی گئی۔ غیر قانونی طریقوں سے منتقل ہونے والا پیسہ یقیناً اس سے کہیں زیادہ ہوگا۔ یعنی عوام کی محنت کو لوٹ کر حاصل کی گئی رقم سرمایہ دار ملک سے باہر منتقل کررہے ہیں کیونکہ وہ خود جانتے ہیں کہ یہ معیشت گہری کھائی کے دہانے پر موجود ہے۔

اسی طرح نجی شعبے کو قرضے معاف کرنے کی بدعنوانی کا سلسلہ بھی جاری ہے جس پر اسٹیٹ بینک نے ان بینکوں کو سرکلر 29 کے ذریعے تنبیہہ کی۔ ان بینکوں نے اسے غیر اسلامی قرار دے کے شرعی عدالت میں چیلنج کر دیا جس پر فیصلہ گزشتہ آٹھ سال سے التوا کا شکار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نام نہاد اسلامی بینکوں میں حقیقی شرح سود اور لوٹ مار دوسروں کی نسبت کہیں زیادہ اور شرعی بینکاری کے دھوکے کے ذریعے زیادہ بدعنوانی کی جارہی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں کسی بھی صورت سود سے چھٹکارا حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ صرف ایک سوشلسٹ انقلاب ہی اس سودی بینکاری کے نظام کا مکمل خاتمہ کرسکتا ہے جب ان تمام بینکوں کو مزدوروں کے جمہوری کنٹرول میں لے لیا جائے گا اور سرمایہ داروں کی تمام تر دولت کو ضبط کرلیا جائے گا۔

نجکاری

برباد معیشت کی بحالی کے لیے آئی ایم ایف کی جانب سے پیش کیے جانے والا نسخہ کیمیا نجکاری کا ہے۔ اس نسخے پر عملدرآمد سے معیشت بحال ہونے کی بجائے مزید برباد ہوئی ہے جبکہ بڑے سرمایہ داروں کی لوٹ مار میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ 90ء کی دہائی میں بجلی کی پیداوار کے شعبے کی نجکاری کو ملک کی ترقی اور خوشحالی کا ضامن قرار دیا جارہا تھا اور خوفناک لوٹ مار کے جو معاہدے کیے جارہے تھے انہیں عوام کے سامنے ہر گاؤں تک بجلی پہنچانے کی کلید بنا کر پیش کیا جارہا

تھا۔لیکن وقت اور حالات نے ثابت کیا ہے کہ اس شعبے کی نجکاری سے ہزاروں صنعتیں بند ہوئی ہیں اور لاکھوں افراد بیروزگار ہوئے ہیں جس سے معیشت مفلوج ہونے کی جانب بڑھی ہے۔اسی طرح بینکوں کی نجکاری کے اثرات کا ہم پہلے ہی جائزہ لے چکے ہیں۔جبکہ دیگر شعبوں کی نجکاری کا نتیجہ بھی معاشی بدحالی کی صورت میں نکلا ہے۔موجودہ حکومت نے بھی برسر اقتدار آتے ہی 68 اداروں کی نجکاری کا اعلان کیا تھا اور آئی ایم ایف سے ہونے والے معاہدے کی بھی اہم شرائط میں یہ شامل تھا کہ پی آئی اے، واپڈا، اسٹیل مل سمیت اہم اداروں کی نجکاری کی جائے اور اس سے حاصل ہونے والی رقوم قرضوں کی ادائیگی کے لیے خرچ کی جائیں۔حکمرانوں کو بھی اس پالیسی میں لوٹ مار کے بھرپور مواقع نظر آئے اور انہوں نے ان اداروں کو اپنی ذاتی ملکیت بنانے کے لیے سرتوڑ کوشش شروع کر دیں۔لیکن ان اداروں میں محنت کشوں کے شدید ردعمل کے باعث اس عمل کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچایا جا سکا۔بینظیر بھٹو کے پہلے دور حکومت سے شروع ہونے والی نجکاری کی پالیسی کے ذریعے جہاں بڑے پیمانے پر اداروں کو بیچا گیا ہے وہاں ملک میں مزدور تحریک کو بھی کمزور کیا گیا ہے۔اس سارے عرصے میں جہاں سوویت یونین کے انہدام کے بعد بائیں بازو کی سیاست اور نظریات کی پسپائی نظر آتی ہے وہاں مزدور تحریک کے بڑے قائدین کی غداریاں بھی نظر آتی ہیں جو ریاست کے دباؤ یا ذاتی مفادات کے لالچ میں ان تحریکوں کو بیچ کر کروڑ پتی بن گئے۔اس دوران نجی شعبے میں مزدوروں کے استحصال میں کئی گنا اضافہ ہوا اور کام کے اوقات کار میں بہت زیادہ اضافے کے ساتھ ساتھ حقیقی اجرتوں میں بڑے پیمانے پر کمی دیکھنے میں آئی۔موجودہ حکومت کی نجکاری کی کوششیں اس ملک کی مزدور تحریک کے آخری قلعوں پر حملہ ہے جو واپڈا اور پی آئی اے میں نظر آتا ہے۔جس طرح ان اداروں میں یونینوں کو کمزور کر کے نجکاری کی جا رہی ہے اس کے بعد یونینیں اس ملک میں ماضی کا قصہ بن کر رہ جائیں گی۔گو کہ مزدور تحریک کی ایک نئی اٹھان کے بڑے امکانات بھی موجود ہیں اور یہ حملے جہاں یونینوں کو کمزور کر رہے ہیں وہاں مزدور تحریک کو بوسیدہ قیادتوں کے بوجھ سے بھی چھٹکارا دلا رہے ہیں۔

آئی ایم ایف کے تین سالہ پروگرام کے تحت 68 میں سے 16 اداروں کی ترجیحی بنیادوں پر نجکاری کا فیصلہ کیا گیا تھا۔لیکن اس دوران صرف حبیب بینک، یونائیٹڈ بینک، الائیڈ بینک، پاکستان پٹرولیم اور نیشنل پاور کنسٹرکشن کمپنی کی باقی ماندہ نجکاری ہی کی جا سکی۔آئی ایم ایف کی ان اہداف کے حصول میں ناکامی کے باوجود قسطوں کی ادائیگی اس کی حکومت سے نرمی برتنے کی

غمازی کرتی ہیں۔اس کی بڑی وجہ اس دوران امریکی افواج کی افغانستان میں موجودگی اور وہاں سے انخلا تھا جس کے لیے امریکہ کو پاکستانی ریاست کے تعاون کی اشد ضرورت تھی۔اسی وجہ سے آئی ایم ایف ان اہداف کے حصول میں ناکامی کے باوجود قرضے کی قسطیں جاری کرتا رہا۔لیکن اب اس مالی سال میں نجکاری کے اہداف کو حاصل کرنے کی منصوبہ بندی کی جارہی ہے۔آئی ایم ایف کی سربراہ کرسٹین لیگارڈ کے حالیہ دورہ پاکستان کی اہم وجہ بھی یہی ہے کہ وہ پاکستان پر نجکاری کے اہداف کے حصول کے لیے دباؤ ڈالے۔

نجکاری کے وزیر محمد زبیر کے روزنامہ دی نیوز میں 27 ستمبر کو شائع ہونے والے مضمون میں ان اہداف کے حصول کو واضح کر دیا گیا ہے۔اس کے مطابق پی آئی اے کو نجکاری کی غرض سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور جلد ہی اس کو بیچنے کے عمل کا آغاز کر دیا جائے گا۔اسی طرح پاور کمپنیوں کو IPO کے زیادہ تیز طریقہ کار سے بیچا جائے گا جس کے مطابق کراچی سٹاک ایکسچینج میں ان کے 15 سے 20 فیصد حصص کی بولی لگائی جائے گی جہاں سے سرمایہ دار انہیں خرید سکیں گے۔ اس کے لیے فیصل آباد الیکٹرک سپلائی کارپوریشن (فیسکو) سرفہرست ہے جسے نومبر 2016ء میں بیچنے کا ہدف لیا گیا ہے جبکہ لاہور اور اسلام آباد کی کمپنیاں اس کے بعد ہیں۔اسی طرح اس مالی سال کے دوران اسٹیل مل کی بھی نجکاری مکمل کر دی جائے گی۔اس کے علاوہ کوٹ ادو پاور کمپنی کے باقی ماندہ حصص کی فروخت اور ایس ایم ای بینک کو بھی بیچا جائے گا۔لیکن اس سارے عمل کو ملک کی عمومی سیاسی صورتحال اور مزدور تحریک کی مزاحمت سے کاٹ کر نہیں دیکھا جا سکتا۔فوج کے ساتھ برسرپیکار لڑکھڑاتی حکومت کبھی بھی اتنے بڑے اقدامات فیصلہ کن انداز میں نہیں کر سکتی اور اس کے لیے تذبذب کا شکار رہے گی۔جبکہ اس دوران ایک جانب آئی ایم ایف کے دباؤ میں شدت آئے گی اور دوسری جانب مزدور تحریک کی مزاحمت حکومت کے جارحانہ عزائم میں رخنہ ڈالے گی۔اس کا حتمی فیصلہ ملک میں طبقاتی توازن کی کیفیت کرے گی۔لیکن اگر کسی طور حکومت یہ نجکاری کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتی ہے تو بھی مزدور تحریک کو ابھرنے سے نہیں روک سکتی۔

کالا دھن

کالا دھن پاکستان کی معیشت کا ناگزیر حصہ بن چکا ہے اور اس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ سرکاری معیشت کی نسبت اس کی شرح ترقی زیادہ ہے اور اس نے بڑے پیمانے پر روزگار بھی فراہم

کر رکھا ہے۔ پراپرٹی کے کاروبار میں ایک لمبے عرصے سے استحکام اور بینکوں کے منافعوں کی ایک بڑی وجہ یہی کالا دھن ہے۔ ایک طرف تو یہ منشیات فروشی سے لے کر اسلحے، اغوا برائے تاوان اور دیگر ایسے جرائم کی بنیاد ہے جس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور عالمی سطح پر سامراجی طاقتوں کی لڑائی سے لے کر ریاست کی شکست و ریخت کے باعث اس میں اضافہ ہوگا۔ دوسری جانب یہ معیشت کے اس حصے پر مبنی ہے جو سرکار کے کسی کھاتے میں موجود نہیں۔ ٹیکس چوری اور بجلی چوری سے لے کر کسٹم ڈیوٹی کی عدم ادائیگی تک ہزاروں ایسے رستے ہیں جہاں سے سرمایہ دار اپنی دولت میں مسلسل اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں جبکہ ریاست کی آمدن میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہو پا رہا۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ حکمران بھی اسی چوری کرنے والے سرمایہ دار طبقے کا حصہ ہیں اور ریاست کے اداروں میں اتنی طاقت نہیں کہ ان سب چوریوں کو روک سکے۔ بلکہ حکومتی پالیسیوں سے اس چوری میں حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

کالے دھن کی معیشت سماج میں مخصوص اثرات مرتب کرتی ہے۔ سرمایہ داری کے روایتی اصولوں کے مطابق صنعتوں اور شرح ترقی میں اضافے کی بنیاد پر تشکیل پانے والے سماج میں سماجی و سیاسی اداروں، اخلاقیات، ادب، فن اور دیگر شعبوں کی کیفیت مختلف ہوتی ہے۔ لیکن ایک ایسا سماج جس میں کالا دھن رگ و پے میں سرایت کر چکا ہو ایک بدبودار جوہڑ کی کیفیت اختیار کر جاتا ہے جس میں کسی بھی قسم کی صحت مند سرگرمی ممکن نہیں۔ یہ ملک اس کی ایک زندہ مثال ہے۔ اس کالے دھن کی آمدن پر کبھی مذہبی تقریبات کا نقاب ڈال کر پردہ پوشی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور کبھی فرسودہ سماجی رسوم و رواج کی آڑ میں جرائم کو فروغ دیا جاتا ہے۔ حالت یہ ہو چکی ہے کہ کھیل کے میدانوں میں بھی اس معیشت کی حکمرانی ہے اور کرکٹ میچوں کے نتائج تک بڑے بڑے جواری طے کرتے ہیں۔

ان مجرمانہ ذرائع سے ہونے والی آمدن کبھی بھی سماج میں بہتری نہیں لا سکتی اور اس کے ہر حصے کو مزید گراوٹ اور ذلت میں دھکیلنے کا باعث بنے گی۔ اس نظام میں کوئی بھی جمہوری یا آمرانہ حکومت اس کا خاتمہ نہیں کر سکتی بلکہ اس کی حمایت سے ہی برسر اقتدار آ سکتی ہے اور اس کو فروغ دینے سے ہی اپنے اقتدار کو طوالت دے سکتی ہے۔ صرف محنت کش طبقے کی ایک سوشلسٹ فتح ہی اس زہریلی معیشت کے ناسور اور اس پر پلنے والی رجعتی قوتوں کو جڑ سے اکھاڑے گی۔

4۔ پاک چین اقتصادی راہداری اور چینی سامراج کا غلبہ

اس وقت ہر طرف پاک چین اقتصادی راہداری (سی پیک) کے گن گائے جا رہے ہیں۔ بائیں بازو کے نام نہاد دانشوروں سے لے کر دائیں بازو کے معیشت دانوں تک اور رجعتی ملاؤں سے لے کر قوم پرستوں تک ہر کوئی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے لیے بیتاب ہے۔ پاکستان اور چین کی ہمالیہ سے بلند دوستی کے ترانے گاتے گاتے اس ملک کو گہری کھائی میں دھکیلا جا رہا ہے۔ آغاز میں چین کی دنیا میں ہونے والی دیگر سرمایہ کاریوں کی طرح اس کی تفصیلات بھی منظر عام پر نہیں آئیں اور صرف 46 ارب ڈالر کے عدد کا اعلان کیا گیا۔ جو پاکستان کے حکمرانوں کی زبانیں لٹکانے اور رالیں ٹپکانے لیے کافی تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان معاہدوں کی تفصیلات کسی حد تک سامنے آ رہی ہیں جس کے باعث خود حکمرانوں کے ایوانوں میں بھی خطرے کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ جہاں ایک طرف حکمران طبقے کے مختلف حصے اتنی بڑی سرمایہ کاری میں اپنا حصہ بٹورنے کے لیے برسر پیکار ہیں وہاں دوسری جانب کچھ اسے ایک نئی ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' بھی قرار دے رہے ہیں۔ ریلوے لائن کے انفرااسٹرکچر میں ایشین ڈویلپمنٹ بینک کی مدد سے آٹھ ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کے اعلان سے سی پیک کا کل حجم 51.5 ارب ڈالر تک پہنچ چکا ہے۔ یہ تمام رقم مختلف قسم کے قرضوں کی شکل میں مہیا کی جائے گی۔ 46 ارب ڈالر میں سے 35 ارب ڈالر انرجی کے منصوبوں کے لیے مختص ہے جبکہ 11 ارب ڈالر انفرااسٹرکچر کے منصوبوں کے لیے۔ پاکستان پر اس وقت کل بیرونی قرضہ 73 ارب ڈالر سے تجاوز کر چکا ہے۔ ایسے میں تقریباً 52 ارب ڈالر کے مزید قرضے ملک کو چینی سامراج کے مالیاتی شکنجے میں مضبوطی سے جکڑنے کا باعث بنیں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس منصوبے کے تمام پہلوؤں اور اس کے اثرات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے۔

سی پیک منصوبہ

یہ منصوبہ چین کے ایک ''ایک بیلٹ ایک سڑک'' منصوبے کا حصہ ہے جس میں 700 ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کی جانی ہے۔ گو کہ اس وقت اعلان کردہ منصوبوں کی رقم اس سے کہیں زیادہ تجاوز کر چکی ہے۔ اس منصوبے کے مطابق وسطی ایشیائی ممالک اور روس کے علاوہ جنوبی ایشیا میں بھی بڑے منصوبے شروع کیے جا رہے ہیں۔ گوادر کے علاوہ سری لنکا میں ہمبن تو تا کے مقام پر بھی ایک بندرگاہ تعمیر کی جا رہی ہے جبکہ اکتوبر میں چینی صدر کے بنگلہ دیش کے دورے کے دوران 20 ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کا اعلان کیا گیا۔ اسی طرح روس کے ساتھ تیل اور گیس کی پائپ لائن بچھانے کے علاوہ وسطی ایشیائی ممالک کے ساتھ تجارت کے رستے تعمیر کیے جا رہے ہیں۔

چین میں منصوبہ بند معیشت کے خاتمے اور سرمایہ داری کی بحالی کے دوران مشرقی علاقوں میں ''خصوصی اکنامک زون'' تعمیر کیے گئے جن میں بڑے پیمانے پر صنعتیں تعمیر کی گئیں اور محنت کشوں کا استحصال کیا گیا اور وہاں سے پوری دنیا میں چینی مال کی تجارت کا آغاز ہوا۔ لیکن اس دوران زیادہ تر وسطی اور مغربی علاقے پسماندہ رہے۔ موجودہ سی پیک کے منصوبوں کے تحت چین کے مغربی صوبے سنکیانگ میں صنعت و تجارت کو فروغ دیے جانے کا ارادہ ہے۔ اس صوبے کی سرحد آٹھ ممالک سے ملتی ہے جن میں پاکستان کے علاوہ روس، قزاقستان، کرغزستان، تاجکستان، منگولیا، ہندوستان اور افغانستان شامل ہیں۔ سی پیک منصوبے کے تحت چین کے اس مغربی صوبے سے گوادر کی بندرگاہ تک مال کی ترسیل کے لیے سڑکوں اور ریلوے لائنوں کا جال بچھایا جائے گا۔ اعلان کیے جانے والے مقاصد کے مطابق اس رستے سے چین کے مشرق وسطیٰ کے ساتھ تجارتی روٹ کا فاصلہ نصف ہو جائے گا۔ پہلے جو تجارت مشرقی چین میں جنوبی چائنہ سمندر اور آبنائے ملاکا کے ذریعے ہوتی تھی اس کے ذریعے اس مال کو 9912 میل کا سفر طے کرنا پڑتا ہے جبکہ کاشغر سے گوادر تک کے تجارتی رستے کے ذریعے اس مال کو مشرقِ وسطیٰ سے وسطی چین تک 3626 میل جبکہ مغربی چین تک صرف 2295 میل کا سفر طے کرنا پڑے گا۔ اس منصوبے کے ذریعے سنکیانگ کی معیشت کو بھی فروغ دیا جائے گا جہاں فارچون 500 میں شامل پندرہ بڑی کمپنیوں سمیت دیگر پہلے سے سرمایہ کاری کر چکی ہیں۔ سنکیانگ میں اس وقت تقریباً پچاس ہزار میگا واٹ بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے جبکہ 2015ء میں کوئلے سے چلنے والے مزید منصوبوں کے اعلان کے بعد یہ صلاحیت جلد 69 ہزار میگا واٹ تک پہنچ جائے گی۔ سنکیانگ میں

صنعتوں کے لیے بجلی کی قیمت 5.47 روپے فی کلوواٹ گھنٹے کے قریب ہے۔

سی پیک کے تمام منصوبوں کے لیے چینی بینک چینی سرمایہ کاروں کو قرضے دیں گے۔ اس حوالے سے تو لگتا ہے کہ ملکی معیشت پر کوئی بوجھ نہیں پڑے گا اور چینی کمپنیاں تمام نفع نقصان کی ذمہ دار ہوں گی لیکن یہ سراسر غلط ہے۔ پاکستان کی حکومت چینی کمپنیوں کی جانب سے لگائے جانے والے منصوبوں سے بجلی خریدنے کی پابند ہو گی خواہ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح ان منصوبوں کی عالمی سطح پر بولی نہیں لگائی جاسکتی اور اس لیے چینی کمپنیاں جس نرخ پر بھی حکومت کو بجلی فروخت کریں گی وہ قبول کرنا ہوگا۔ اس طرح انفرااسٹرکچر کے منصوبوں پر دیا جانے والا 11 ارب ڈالر کا قرضہ 1.6 فیصد سالانہ سود کے ساتھ 25 سالوں میں واپس کرنا ہوگا۔ جبکہ بجلی کی پیداوار کے منصوبوں کے لیے دیا گیا 35 ارب ڈالر کا قرضہ 4.95 فیصد سالانہ سود کے ساتھ دس سالوں میں واپس کرنا ہوگا۔ اس قرضے میں 0.5 فیصد LIBOR اور 4.5 فیصد کا سپریڈ بھی شامل کرنا ہو گا۔ اس شرح کے مطابق سالانہ 3.940 ارب ڈالر اصل رقم کی مد میں جبکہ 1.908 ارب ڈالر سود کی مد میں یعنی کل 5.858 ارب ڈالر ادا کرنے ہوں گے۔ یہ جی ڈی پی کے دو فیصد کے برابر بنتا ہے۔ پہلے سے موجود آئی ایم ایف اور دیگر اداروں کے قرضوں کی ادائیگیاں اس کے علاوہ ہیں۔ اس کے علاوہ ان منصوبوں پر پاکستان نے سرمایہ کار کمپنیوں کو ایکویٹی پر 27 فیصد سے 30 فیصد سالانہ منافع کی ضمانت فراہم کی ہے۔ یہ تمام ادائیگیاں ڈالر میں کرنی ہوں گی۔

منصوبے کے مطابق 10,400 میگاواٹ کے ترجیحی منصوبے 18-2017ء میں کام شروع کر دیں گے جس کے ساتھ ہی قرضوں کی ادائیگی، کوئلے کی درآمد کی قیمت اور منافعوں کا حصول شروع ہو جائے گا۔ یہ ادائیگیاں ہر پندرہ دنوں بعد کی جائیں گی۔ حکومت پاکستان معاہدے کے مطابق 30 سال تک یہ بجلی مقرر کردہ نرخوں پر خریدنے کی پابند ہوگی۔ اگر یہ تمام منصوبے کوئلے پر ہوں تو پاکستان کو سالانہ ڈھائی ارب ڈالر تک ادا کرنے پڑ سکتے ہیں۔ اسی طرح روپے کی قدر میں کمی اور دیگر وجوہات کے باعث اس میں اضافہ بھی متوقع ہے۔ اس طرح نرخوں میں بھی ہر پانچ سال بعد اضافہ کرنے کی اجازت ہے۔ ان منصوبوں کے تحت پیدا کی جانے والی بجلی کے نرخ اتنے زیادہ ہیں کہ خریدنے والے کا دیوالیہ ناگزیر ہے خواہ وہ حکومت ہی کیوں نہ ہو۔ شمسی توانائی کے ایک منصوبے میں بجلی کا نرخ 17 روپے فی یونٹ طے کیا گیا ہے جبکہ عالمی سطح پر یہ 4 روپے فی یونٹ ہے۔ صرف اس ایک عدد سے نظر آتا ہے کہ دونوں ملکوں کے حکمران اس منصوبے کے تحت

کتنی بڑی لوٹ مار کر رہے ہیں۔اسی طرح حال ہی میں چین کی انڈونیشیا میں ہونے والی سرمایہ کاری ایک مثال ہے جس میں چینی کمپنیوں نے دس ہزار میگا واٹ کے بجلی کے منصوبے لگائے لیکن چند ہی سالوں میں ان میں سے نصف ناکارہ ہو گئے۔تندی پور منصوبے کا بھی یہی حال ہے جہاں اتنی بڑی لاگت کے باوجود ایک یونٹ بھی بجلی کا پیدا نہیں کیا جا سکا۔حکومت کے دباؤ کی تاب نہ لاتے ہوئے چیئرمین واپڈا مستعفی ہو گیا اور اب اس کی جگہ ایک جرنیل کو بٹھا دیا گیا ہے تاکہ بدعنوانی کے ان منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ایک اندازے کے مطابق چین کے ساتھ ہونے والے معاہدوں میں 35 سے 50 فیصد تک کمیشن دیا جاتا ہے جس کے باعث حکمران چین کے ساتھ منصوبوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔لیکن اتنے بڑے کمیشن دینے کے باعث ان منصوبوں پر عملدرآمد کم ہی ہوتا ہے اور زیادہ تر رقم بدعنوانی کے ذریعے ہڑپ کر لی جاتی ہے۔یہ منصوبے عالمی سطح پر سرمایہ کاری کے اصولوں کے بھی خلاف ہیں کیونکہ ان میں سرمایہ کاری کے لیے تمام تر رقم قرضوں کے ذریعے دی جائے گی اور وصولی عوام سے کی جائے گی جبکہ منافعوں کی ضمانت بھی دی گئی ہے۔

سویلین حکمرانوں کے ساتھ ساتھ فوجی جرنیل بھی اس منصوبے کی برکات سے فیض یاب ہونے کے لیے بے چین ہیں۔اسی مقصد کے لیے اس منصوبے کی سکیورٹی کے لیے بارہ ہزار افراد پر مشتمل ایک سکیورٹی فورس بنانے کا اعلان کیا گیا اور آرمی چیف نے چین کے دورے کے دوران چینی صدر کو اس منصوبے کی تیاری سے متعلق آگاہ کیا۔لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس کے اخراجات کون برداشت کرے گا اور اس کو سی پیک سے آنے والی رقم سے کیسے منسلک کیا جائے۔سویلین اور فوجی حکمرانوں کے درمیان تنازعے کی ایک بڑی وجہ بھی یہی تھی۔بالآخر وزیر خزانہ اور آرمی چیف کی 21 ستمبر کو ہونے والی ملاقات میں اس فورس کے اخراجات کو عوام پر ڈال دیا گیا ہے اور نیپرا کو ہدایات جاری کر دی گئی ہیں۔مہنگی بجلی کے ساتھ ساتھ سکیورٹی اخراجات بھی بجلی بلوں کے ذریعے پورے کیے جائیں گے۔رپورٹ کے مطابق سی پیک سے وابستہ منصوبوں کی لاگت میں اس سکیورٹی فورس کے لیے ایک فیصد اضافہ کر دیا گیا ہے جو بجلی کے بلوں میں ایک فیصد اضافے کے ذریعے وصول کی جائے گی۔گوادر سے نواب شاہ تک 1.353 ارب ڈالر کی لاگت سے بچھائی جانے والی 700 کلومیٹر ایل این جی پائپ لائن کا منصوبہ ابھی تک سی پیک کا حصہ نہیں تھا لیکن اس کی لاگت میں بھی سکیورٹی کی غرض سے ایک فیصد کا اضافہ کر دیا گیا ہے جو کہ صارفین سے وصول کیا

جائے گا۔اسی طرح سی پیک کی سڑکوں کی سکیورٹی کی قیمت کو ٹال ٹیکس میں شامل کیا جائے گا۔

اسی طرح آئے روز منصوبوں کی لاگت میں نئے اضافے کیے جاتے ہیں جبکہ مختلف منصوبوں کے ذریعے پیدا ہونے والی بجلی کے نرخ بھی اپنی مرضی سے بڑھا دیے جاتے ہیں۔آخر کار اس تمام تر بدعنوانی اور قرضوں کا بوجھ بالواسطہ ٹیکسوں کے ذریعے عوام پر ڈالا جائے گا۔اس بے دریغ لوٹ مار کے حوالے سے حکمرانوں میں بھی بے چینی نظر آ رہی ہے اور وہ خدشات کا اظہار کر رہے ہیں۔سینیٹ کی قائمہ کمیٹی برائے پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ کے ایک اجلاس میں اس کا کھل کر اظہار کیا گیا اور اس منصوبے کو ایسٹ انڈیا کمپنی سے تشبیہہ دی گئی۔اس کمپنی نے بھی ہندوستان میں معاشی مقاصد سے اپنا آغاز کیا تھا لیکن بتدریج پورا ہندوستان برطانوی سامراج کی نوآبادی بن گیا۔کمیٹی کو یہ بھی بتایا گیا کہ اس منصوبے کو ''چینی سرمایہ کاری'' کہہ کر تشہیر کی جا رہی ہے جبکہ یہ منصوبہ چینی سرمایہ کاری سے زیادہ مقامی پیسے پر انحصار کرتا ہے۔کمیٹی کے سربراہ طاہر مشہدی نے کہا کہ،''یہ ہمارے لیے نقصان دہ ہوگا اگر اس کا تمام تر بوجھ ہمیں برداشت کرنا پڑے۔کیا یہ منصوبہ قومی ترقی ہے یا قومی سانحہ؟ چین سے لیے جانے والے تمام قرضے پاکستان کے غریب لوگوں کو ادا کرنے پڑیں گے۔''

آئی ایم ایف نے بھی پاکستان کو اس منصوبے کے حوالے سے تنبیہہ کی ہے اور ''سی پیک کے منڈلاتے بل'' کے خطرے سے آگاہ کیا ہے۔آئی ایم ایف کے مطابق یہ منصوبہ معیشت کو ترقی دینے کی بجائے مزید مشکلات کا شکار کر سکتا ہے۔رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ،''سرمایہ کاری کے ابتدائی فیز میں جیسے جیسے 'جلد مکمل ہونے والے منصوبے' تکمیل کے مراحل میں پہنچیں گے پاکستان میں بیرونی سرمایہ کاری اور دیگر آنے والی رقوم میں اضافہ ہوگا۔لیکن منصوبوں کی درآمدی ضروریات کے باعث آنے والی رقوم کی حاصلات کم ہو جائیں گی اور کرنٹ اکاؤنٹ خسارہ بڑھے گا۔اس کے بعد پاکستان کو سی پیک سے وابستہ باہر جانے والی رقوم کا انتظام کرنا پڑے گا۔اس سے بیرونی سرمایہ کاری کی نسبت قرضوں اور ادائیگیوں میں واضح طور پر اضافہ ہوگا۔''

اس سے واضح نظر آتا ہے کہ سی پیک ملکی معیشت پر ایک بہت بڑا بوجھ بن کر نازل ہو رہا ہے جس کے باعث معیشت پر قرضوں کے بوجھ میں کئی گنا اضافہ ہوگا جبکہ مقامی حکمرانوں کے علاوہ چینی حکمرانوں اور کمپنیوں کی لوٹ مار کی قیمت بھی یہاں کے غریب عوام کو چکانی پڑے گی۔بجلی کے ان منصوبوں سے پیدا ہونے والی بجلی تمام اخراجات اور لائن لاسز سمیت تقریباً 14 روپے فی یونٹ

ملے گی جو سنکیانگ میں ملنے والی ساڑھے پانچ روپے فی یونٹ سے کہیں زیادہ ہے۔اس لیے چینی صنعتکار پاکستان میں صنعتیں لگانے کی بجائے سنکیانگ کو ہی ترجیح دیں گے۔اس کے علاوہ چین صنعتکاروں کو خصوصی مراعات دیتا ہے جو پاکستان کی نسبت کہیں زیادہ ہیں جس کے باعث چین کے صنعتکار کو پاکستان میں صنعتیں لگانے سے کوئی دلچسپی نہیں۔اس حوالے سے واضح ہے کہ اس تمام تر سرمایہ کاری سے معیشت کے لیے سازگار ترین حالات میں بھی صنعتیں لگنے اور روزگار کے مواقع پیدا ہونے کی کوئی امید نہیں۔ بلکہ تمام تر چینی سرمایہ کاری کا مقصد قرضوں کے ذریعے یہاں کے عوام کو لوٹنا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ چین سے آنے والی درآمدات نے مقامی صنعت کو پہلے ہی بڑے پیمانے پر نقصان پہنچایا ہے اور ہزاروں صنعتیں صرف اس لیے بند ہوگئی ہیں کیونکہ وہ چین کی سستی اشیا کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ پاکستانی ریاست کی چین کے مقابلے میں کمزوری اور خصی پن کے باعث وہ چین سے آنے والی درآمدی اشیا کو نہیں روک سکتی۔ امریکہ کی مضبوط معیشت اس حوالے سے مشکلات کا شکار ہے ایسے میں پاکستان کے مقامی سرمایہ داروں کے تحفظ کے لیے کوئی پالیسی بنانا ممکن نہیں۔ پاکستان اور چین کی باہمی تجارت کا حجم 16 ارب ڈالر سالانہ سے تجاوز کر چکا ہے اور اس میں 12.57 فیصد سالانہ کی شرح سے اضافہ ہو رہا ہے۔جس میں پاکستان کی برآمدات کا حصہ انتہائی کم ہے۔اس کے علاوہ چین سے ٹیکسٹائل کی مصنوعات بھی بڑے پیمانے پر درآمد کی جا رہی ہیں جس کے باعث یہاں کی ٹیکسٹائل صنعت مشکلات کا شکار ہے۔سی پیک منصوبے کے تحت جہاں روزانہ بڑے پیمانے پر تجارتی سامان گوادر کی بندرگاہ کے ذریعے دیگر ممالک تک پہنچایا جائے گا وہاں پاکستان میں ان اشیاء کو آنے سے نہیں روکا جا سکتا۔اس دوران پاکستان میں ریاستی اداروں کی بدعنوانی اور لاغر پن کے باعث اسمگلنگ میں اضافہ ہوگا۔ وزارت خزانہ کے مشیر ہارون اختر کے مطابق پہلے ہی سالانہ 9 ارب ڈالر کی اسمگلنگ ہو رہی ہے۔اس منصوبے کے آپریشنل ہونے کے بعد اس میں کئی گنا اضافہ ہوگا اور چینی مصنوعات با آسانی پاکستانی منڈی میں دستیاب ہوں گی اور پاکستان کی نحیف صنعت کو مزید برباد کرنے کی جانب بڑھیں گی۔ پاکستان کے سرمایہ داروں کے تمام تر احتجاج اور ریاست کی نام نہاد یقین دہانیوں کے باوجود اس کو روکا نہیں جا سکتا۔سادہ الفاظ میں پاکستان کی بیس کروڑ آبادی کے لیے چین کی سستی اشیا اور وہ بھی کسی کسٹم وغیرہ کے بغیر دستیاب ہوں گی اور چین کو دنیا بھر میں آسان رسائی کے ساتھ گزرتے گزرتے اتنی

بڑی منڈی بھی ملے گی۔ پاکستان صرف چین کے گزرنے والے ٹرکوں سے ٹرانزٹ فیس وصول کر سکتا ہے جس کے متعلق ابھی تفصیلات منظر عام پر نہیں آئیں۔ لیکن اگر ایسا ہو بھی تو یہ صرف سڑکوں کی مرمت کے لیے ہی کافی ہوگی۔ آغاز میں سی پیک کی سڑکوں کے ساتھ ساتھ خصوصی اکنامک زون بنانے کا ارادہ کیا گیا تھا لیکن پاکستان کی پہلے موجود صنعتوں کی زوال پذیر صورتحال دیکھتے ہوئے اسے مؤخر کر دیا گیا ہے۔ گوادر کی بندرگاہ اور 2300 ایکڑ کے رقبے کو چالیس سال کے لیے چین کو دیا گیا ہے جس میں پورٹ آپریٹر کو بیس سال تک ٹیکس کی مکمل چھوٹ دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ گوادر اور دیگر اکنامک زون میں لگنے والی صنعتوں کو دس سال کے لیے ٹیکسوں کی چھوٹ دی جائے گی۔ گوادر میں بننے والے ملک کے سب سے بڑے ائیر پورٹ اور دیگر انفرااسٹرکچر کا پاکستان کی معیشت کو کوئی فوری مفاد نہیں ملے گا۔ یہاں تک کہ اہم روزگار بھی چینی کمپنیاں چین کے محنت کشوں کو ہی دیں گی جبکہ یہاں پر غیر ہنرمند مزدوروں کو کسی حد تک روزگار ملنے کے امکان ہیں جس میں بلوچستان کے عوام کا حصہ مزید کم ہے۔ قیصر بنگالی کے مطابق ''بلوچستان کے عوام کو محض ٹرکوں کے ٹائروں کے پنکچر لگانے کا ہی روزگار ملے گا۔'' اس حوالے سے چینی سرمایہ کاری سے ہونے والی ملک میں خوشحالی اور ترقی کے دعوے سراسر جھوٹ پر مبنی ہیں اور اس منصوبے کی حقیقت کو عوام سے چھپاتے ہیں۔

چینی معیشت کا زوال اور پالیسی میں تبدیلی

اس منصوبے کے حوالے سے پاکستانی معیشت کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ چین کی معیشت کا بھی جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اور چین کی معیشت کی موجودہ کیفیت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کیا یہ منصوبہ مکمل بھی ہو پائے گا یا نہیں اور کیا چین کی معیشت اس تجارتی رستے سے استفادہ حاصل کرنے کے قابل رہے گی۔

اس وقت چین کی معیشت شدید ترین مشکلات کا شکار ہے اور اس کی شرح ترقی میں مسلسل کمی ہو رہی ہے۔ کچھ عرصہ قبل یہ کہا جا رہا تھا کہ چین کی شرح ترقی 7 فیصد سے کم کسی صورت قبول نہیں کی جا سکتی اور چینی صدر اس کو ہر صورت 7 فیصد سے زیادہ رکھیں گے۔ لیکن اس وقت چین کے حکمرانوں کی تمام کوششوں کے باوجود شرح ترقی 7 فیصد سے کم ہو چکی ہے۔ اس کی بڑی وجہ عالمی معیشت کا بحران ہے جس کے باعث پوری دنیا میں چین کی برآمدات میں کمی آئی ہے۔ چین کی

معیشت امریکہ اور یورپ کے صارفین کی مرہون منت تھی اور چین میں مصنوعات کی پیداوار چین کی داخلی منڈی کی ضروریات سے زائد تھی۔ اپنے تمام تر شرح ترقی کے باوجود چین میں سرمایہ داری کی بحالی کے بعد سے غربت اور بیروزگاری میں اضافہ ہوا ہے اور چین میں صارفین کی وہ منڈی نہیں بن سکی جو امریکہ اور یورپ کے صارفین کی جگہ لے سکے۔ اس لیے مغربی ممالک کے معاشی بحران کے باعث چین کی صنعت شدید ترین زوال کا شکار ہوئی ہے۔ 2008ء کے بعد سے مینوفیکچرنگ کی صنعتوں میں بڑے پیمانے میں گراوٹ آئی ہے۔ اس کو حکومت کی جانب سے سستے قرضوں اور پراپرٹی کے بلبلے نے پُر کرنے کی کوشش کی لیکن اب وہ بھی اپنی انتہاؤں کو چھو کر واپس سکڑ رہے ہیں۔ چین کے بڑے شہروں میں پراپرٹی کی قیمتوں میں کمی کا رجحان ہے جبکہ حکومتی قرضہ تاریخ کی بلند ترین سطح تک پہنچ چکا ہے۔ اس وقت چین دنیا میں سب سے مقروض ملک بن چکا ہے اور اس کا قرضہ 2007ء میں 7 کھرب ڈالر سے بڑھ کر 2014ء کے وسط تک 28 کھرب ڈالر ہو چکا ہے جو جی ڈی پی کا 282 فیصد بنتا ہے۔ اسی طرح چین میں معیشت کی سست روی کے باعث تیل اور دیگر اجناس کی درآمد میں بھی کمی ہوئی ہے جس سے پوری دنیا میں تیل اور دیگر اجناس کی قیمتوں میں گراوٹ آئی ہے۔ نتیجتاً برازیل، ارجنٹائن اور آسٹریلیا سمیت بہت سی معیشتیں زوال کا شکار ہوئی ہیں اور وہاں بھی طلب میں کمی کے باعث چین کی برآمدات میں مزید کمی آئی ہے۔ اب چین لوہے کی بڑی صنعتوں کو بند کر رہا ہے اور وہاں سے بڑے پیمانے پر محنت کشوں کو فارغ کیا جا رہا ہے۔ دیگر شعبوں میں بھی سرمایہ کاری میں کمی آئی ہے۔ ایپل بنانے والی مشہور کمپنی فاکس کان نے بھی اعلان کیا ہے کہ وہ دس لاکھ روزگار ہندوستان منتقل کرے گی۔ ایسے میں چین میں محنت کشوں کی ہڑتالوں میں بہت بڑا اضافہ ہوا ہے اور ہر سال پہلے کی نسبت زیادہ ہڑتالیں دیکھنے میں آتی ہیں۔

اس حوالے سے چینی حکمران اس عرصے میں بڑے بڑے منصوبوں میں سرمایہ کاری کر کے معیشت کو چلانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ سی پیک منصوبے کے ذریعے بھی چینی کمپنیوں کو سرمایہ کاری کے مواقع فراہم کیے جا رہے ہیں تاکہ چینی معیشت کا پہیہ کسی طرح چلتا رہے لیکن اس ساری پالیسی کے نتیجے میں قرضے کا بہت بڑا بوجھ مجتمع ہو چکا ہے جو معیشت کو مزید سست روی کا شکار کر رہا ہے۔ فنانشل ٹائمز کی ایک حالیہ رپورٹ میں چین کی اس پالیسی کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے اور دنیا بھر میں چین کے بڑے پیمانے پر قرضے دینے کی پالیسی کی ناکامی کو عیاں کیا گیا ہے۔

اس رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ چینی حکمران ان ناکامیوں کے باعث اپنی اس پالیسی کو تبدیل کرنے پر غور کر رہے ہیں۔

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ افریقہ اور لاطینی امریکہ سمیت دنیا بھر میں چینی حکمرانوں نے تیل اور دیگر وسائل کی رسد کو محفوظ بنانے کے لیے بڑے پیمانے پر قرضے دیے لیکن اس دوران تیل اور دیگر اجناس کی قیمتیں انتہائی کم ہو چکی ہیں اور 110 ڈالر فی بیرل سے کم ہو کر ایک وقت میں 30 ڈالر فی بیرل تک پہنچ گئی تھیں۔ اس وجہ سے چین کے یہ تمام قرضے ڈوبنے کا اندیشہ ہے جس کے باعث چین کے حکمران فکرمند ہیں۔ رپورٹ کے مطابق گزشتہ دس سالوں میں چینی بینکوں نے تقریباً 700 ارب ڈالر کے قرضے دیے جبکہ اس دوران دیگر چھ بڑے عالمی مالیاتی اداروں نے مل کر بھی اتنے قرضے نہیں دیے۔ ان میں ورلڈ بینک، ایشین ڈویلپمنٹ بینک، انٹر امریکن ڈویلپمنٹ بینک، یورپین انویسٹمنٹ بینک، یورپین بینک برائے تعمیر نو و ترقی اور افریقن ڈویلپمنٹ بینک شامل ہیں۔

2007ء میں جب چین نے وینزویلا کو قرضوں کی فراہمی کا آغاز کیا اس وقت ان کا مقصد وہاں تیل کی رسد کو یقینی بنانا تھا۔ اس دوران ریفائنریوں، سونے کی کانوں، لاجسٹک، تجارت، ریلوے اور دیگر شعبوں کے لیے 65 ارب ڈالر دیے گئے۔ تحقیق کے مطابق ورلڈ بینک نے 1945ء میں اپنے جنم سے اب تک کسی ملک کو، سوائے بھارت کے، 65 ارب ڈالر کا قرضہ اتنی کم مدت میں نہیں دیا۔ وینزویلا اس وقت شدید مشکلات کا شکار ہے اور افراط زر 800 فیصد ہو چکا ہے۔ اس سال مئی میں صدر ماڈورو کی حکومت نے چین سے مذاکرات کے بعد قرضوں کی ادائیگی کو مؤخر کر دیا ہے جو ایک مذاکراتی دیوالیہ ہے۔ اس سے بدتر صورتحال کے امکانات بھی موجود ہیں۔ ریاستی قرضوں کے علاوہ چینی کمپنیوں نے بھی وینزویلا میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی جن میں بجلی، ٹیلی فون، تیل کی ریفائنریوں اور پائپ لائنوں اور ریلوے لائنوں میں سرمایہ کاری شامل تھی جو اب خسارے کا شکار ہے۔

ایک رپورٹ میں چینی بینکوں اور ورلڈ بینک کا ایک موازنہ پیش کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ شدید خطرے کی دوچار معیشتوں میں ورلڈ بینک کے کتنے قرضے خطرے کا شکار ہیں چینی بینکوں کے کتنے۔ اس میں دیوالیہ پن کے لیے ہائی رسک ممالک میں پاکستان سرفہرست ہے۔ ہائی رسک ممالک سے ورلڈ بینک نے 15-2011ء کے دوران 13.1 ارب ڈالر وصول کرنے

تھے جس میں پاکستان سے 7.5 ارب ڈالر اور ایتھوپیا سے 5.6 ارب ڈالر شامل ہیں۔ جبکہ چینی بینکوں نے ہائی رسک ممالک سے 15-2013ء میں 37.8 ارب ڈالر وصول کرنے تھے۔ ان میں وینزویلا سے 9 ارب ڈالر، پاکستان سے 7.8 ارب ڈالر، ارجنٹائن سے 7.6 ارب ڈالر، ایتھوپیا سے 5.8 ارب ڈالر، سوڈان سے 4 ارب ڈالر اور زمبابوے سے 3.6 ارب ڈالر شامل ہیں۔ فنانشل ٹائمز کے حساب کے مطابق قرضے لینے والے دس بڑے ممالک کے تجزیے کے مطابق ورلڈ بینک کی نسبت چینی بینکوں کے قرضے بیس فیصد زیادہ رسک پر ہیں۔ روس کو 15-2013ء کے دوران 15.7 ارب ڈالر کے قرضے دیے گئے اور اس وقت روس کی معیشت شدید بحران کا شکار ہے۔ یہی کیفیت سوڈان اور زمبابوے کی بھی ہے۔ چینی بینکوں نے ان خطرات سے نپٹنے کے لیے شرح سود میں اضافے یا اجناس کی قیمتوں میں ردوبدل میں کوشش کی ہے لیکن یہ سودمند ثابت نہیں ہوسکی۔ دیگر عالمی بینکوں کے ماہرین چین پر الزام لگا رہے ہیں کہ ایشین انفرااسٹرکچر انویسٹمنٹ بینک سمیت دیگر بینک دنیا میں معیشتوں کے دیوالیہ پن کے خدشے میں اضافہ کررہے ہیں جس سے ان کے اپنے قرضے ڈوبنے کا خطرہ ہے۔

حال ہی میں افریقہ کے ایک ملک گھانا نے چین کے 2010ء کے تین ارب ڈالر کے قرضے کے نصف کو کینسل کردیا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ چینی ڈویلپمنٹ بینک قرض کی شرائط کو سخت کررہا تھا اور قرض کے بدلے 13 ہزار بیرل تیل روزانہ کی بجائے 15 ہزار بیرل تیل کا مطالبہ کررہا تھا تاکہ قرضے کو زیادہ سودمند بنایا جاسکے۔ اس کی بڑی وجہ 2010ء کی نسبت تیل کی قیمتوں میں ہونے والی بڑی گراوٹ ہے۔ 2000ء سے 2014ء کے درمیان چین نے افریقی ممالک کو 86.9 ارب ڈالر کے قرضے دیے۔ ان میں انگولا 21.2 ارب ڈالر اور ایتھوپیا 12.3 ڈالر کے ساتھ سرفہرست ہیں۔ اس میں 59.6 ارب ڈالر کے قرضے چین کے ایکسپورٹ امپورٹ بینک کی طرف سے جبکہ 13.7 ارب ڈالر چینی ڈویلپمنٹ بینک کی جانب سے دیے گئے۔ باقی قرضے دیگر چینی کمپنیوں کی جانب سے دیے گئے۔ اب قرضوں کی یہ وصولی شدید مشکلات کا شکار ہے۔ گھانا کے علاوہ انگولا سے بھی قرضوں کے سود کی شرح اور ادائیگی کے طریقہ کار پر دوبارہ مذاکرات کیے جارہے ہیں۔ اسی طرح دنیا کے مختلف ممالک میں چین کی طرف سے بنائی جانے والی بیس کے قریب تیز رفتار ریلوے لائنوں کا ذکر سننے کو ملتا ہے لیکن صرف ترکی میں ابھی تک یہ منصوبہ مکمل ہوسکا ہے۔ بہت سے ملکوں میں منصوبوں پر کام بند ہوچکا ہے جس میں وینزویلا میں 800 ملین

ڈالر کی ممکنہ لاگت سے بننے والا منصوبہ بھی شامل ہے۔ صرف آئندہ ماہ ایتھوپیا میں بننے والی ریلوے لائن تکمیل کے قریب ہے جو یہاں سے خام مال کو جبوتی میں موجود چینی بندرگاہ تک پہنچائے گی۔ لیکن اس کی تکمیل کی وجہ بھی اس اہم مقام پر چین کے بحری اڈے کی موجودگی ہے۔

اس صورتحال میں چینی حکمران اپنی پالیسی کو تبدیلی کر رہے ہیں اور قرضوں کے لیے موجود رسک کو کم سے کم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آغاز میں ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کا مقابلہ کرنے کے لیے کہیں زیادہ دیے جانے والے قرضوں نے چینی حکمرانوں کی رعونت میں اضافہ کیا اور وہ یہ کہتے تھے کہ ہم دنیا میں تیل اور دوسری اجناس کی رسد کو محفوظ بناتے ہوئے مستقبل کے لیے سرمایہ کاری کر رہے ہیں۔ لیکن تیل اور دیگر اجناس کی گراوٹ نے صورتحال کو یکسر تبدیل کر دیا ہے۔ اس وقت ایکسپورٹ امپورٹ بینک کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ یہ لبریز ہو چکا ہے اور مزید قرضے دینے کی اہلیت نہیں رکھتا جبکہ چینی ڈویلپمنٹ بینک بھی شدید خطرات کا شکار ہے اور اس کے بیشتر قرضے ڈوب سکتے ہیں۔

ایسے میں سی پیک کا مستقبل بھی خطرات سے دوچار ہے۔ ایک طرف چین سمیت عالمی معیشت کا آنے والا بحران منڈلا رہا ہے اور دوسری جانب چینی بینک دیوالیہ پن کی نہج کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ اس حوالے سے کوئی بھی بڑا واقعہ اس منصوبے کو منجمد کر سکتا ہے یا پھر اس سے بھی زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ منصوبے کی تکمیل کے بغیر ہی قرضوں کی واپسی کا مطالبہ شروع ہو جائے اور نامکمل سڑکوں اور بجلی کے منصوبوں کی قیمت پاکستان کے غریب عوام کے خون پسینے کی کمائی نچوڑ کر حاصل کی جائے۔

جن ممالک میں چین کی جانب سے بڑے پیمانے پر ریاستی قرضے دیے گئے ہیں وہاں کی معیشت میں چینی کمپنیوں نے بھی بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی ہے۔ پاکستان میں بھی یہی صورتحال ہے۔ اس وقت ٹیلی کمیونیکیشن سے لے کر ریلوے تک چینی کمپنیاں بڑے پیمانے پر پاکستان میں ٹھیکے حاصل کر رہی ہیں اور دیگر تمام کمپنیوں کا صفایا کر رہی ہیں۔ درحقیقت چینی کمپنیوں پر پاکستان کا انحصار بڑھتا جا رہا ہے۔ اسی طرح پاکستان سب سے زیادہ اسلحہ بھی چین سے خرید رہا ہے۔ چین کے لیے بھی پاکستان دنیا میں اسلحے کا سب سے بڑا خریدار ہے۔ 15-2011ء کے پانچ سالوں میں چین کے اسلحے کی برآمدات کا 35 فیصد پاکستان کو برآمد کیا گیا۔

چینی سامراج

اس منصوبے کے معاشی پہلوؤں کی نسبت اس کے سٹریٹجک مقاصد زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔امریکہ اور دیگر مغربی سامراجی ممالک خطے میں اپنے اثر ورسوخ کے لیے اس منصوبے کو خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔ برطانوی اخبار گارڈین میں شائع ہونے والے جان بون کے ایک مضمون کے مطابق سمندری رستے کی بجائے ہمالیہ کے دشوار گزار رستوں کو تجارت کے لیے استعمال کرنے کی بجائے چین گوادر کی بندرگاہ کو عسکری مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔مضمون کے مطابق،

''کاغذوں پر ایسا ہی لگتا ہے کہ سنکیانگ میں ایکسپورٹرز کو بحیرۂ عرب اور عالمی منڈی تک رسائی کے لیے مشرقی چین کی نسبت مختصر رستہ دستیاب ہوگا۔جبکہ عملی طور پر لوگ حیرانگی اور شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ پہلے سے موجود سمندری رستے کی نسبت دنیا کے اونچے ترین پہاڑی سلسلے سے اشیا کو ٹرکوں کے ذریعے لیجانا کیسے سستا ہوسکتا ہے۔انہیں شک ہے کہ چین گوادر میں خلیج کے تیل کی رسد کے قریب ایک بحری اڈہ بنانے میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہے''۔(گارڈین، 4 فروری 2016ء)

بحیرۂ عرب میں واقع آبنائے ہرمز سے دنیا کے چالیس فیصد تیل کی تجارت ہوتی ہے اور یہ ایران اور سعودی عرب جیسے ممالک کے لیے اہمیت کا حامل ہے۔امریکہ نے اس خطے میں اپنے سامراجی مفادات کے تحفظ کے لیے بحرین میں مستقل طور پر بحری بیڑہ لنگرانداز کر رکھا ہے۔چین کی یہاں موجودگی پورے خطے میں طاقتوں کا توازن تبدیل کر سکتی ہے۔ایران اور امریکہ کے تعلقات کی بحالی کے باوجود ایران کے چین سے قریبی تعلقات موجود ہیں اور چین پہلے بھی پابندیوں کے باوجود ایران سے بڑے پیمانے پر تیل درآمد کر رہا تھا۔ایران پر عالمی سطح پر پابندیوں کے خاتمے کے صرف ایک ہفتے بعد چینی صدر نے ایران کا دورہ کیا اور 25 سالہ منصوبے کا اعلان کیا جس میں اس دوران باہمی تجارت کو 600 ارب ڈالر تک لیجانے کا ہدف طے کیا گیا۔تیل کی قیمتوں میں گراوٹ سے قبل 2014ء میں دونوں ممالک کی باہمی تجارت کا حجم 52 ارب ڈالر سالانہ تھا۔اسی طرح ایران چین کی مصنوعات کے لیے اہم منڈی ہے۔ایران کے پاکستان میں موجود سفارتکار نے بھی سی پیک کا حصہ بننے کی خواہش کا اظہار کیا ہے جسے چین نے خوش آمدید کہا ہے۔لیکن اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ گوادر میں چین اس خطے میں تمام تر سرمایہ کاری کو تحفظ دینے

اور سامراجی مفادات کی نگہبانی کے لیے بحری اڈہ بنانے کی طرف بڑھے گا جس سے ایران اور سعودی عرب سمیت امریکہ اور بھارت خوف کا شکار ہیں۔اس لیے وہ چینی سامراج کے پھیلاؤ کو روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بحیرۂ عرب کے علاوہ پورے بحر ہند میں چین ایک ابھرتی ہوئی سامراجی قوت کی طرح اپنے پر پھیلا رہا ہے جس سے بھارت کے سامراجی مفادات کو ٹھیس پہنچ رہی ہے۔اسی لیے امریکی پشت پناہی سے بھارت چین کے اس پھیلاؤ کو روکنے کی کوشش کر رہا ہے۔اس کے لیے بھارت نے ایران کی بندرگاہ چاہ بہار میں بیس کروڑ ڈالر کی سرمایہ کاری کا اعلان کیا ہے اور اس بندرگاہ کے ذریعے افغانستان اور وسطی ایشیا کے دیگر ممالک تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔امریکہ نے اس معاہدے کی حمایت کا اعلان کیا ہے۔ یہ بندرگاہ گوادر سے صرف سو کلومیٹر کے فاصلے پر موجود ہے اور اس کے فعال ہونے سے بھارتی مصنوعات کو افغانستان اور وسطی ایشیا تک پہنچنے کے لیے پاکستان سے نہیں گزرنا پڑے گا۔امریکی پشت پناہی سے بھارت پہلے ہی افغانستان میں اپنے قدم جما رہا ہے جس سے پاکستان کے سامراجی مفادات متاثر ہوئے ہیں۔لیکن اس دوران بھارت اور چین کے مفادات جہاں خطے میں ٹکراؤ کا شکار ہیں وہاں یہ آپس میں جڑے بھی ہوئے ہیں۔ بھارت اور چین کی باہمی تجارت کا حجم سوا ارب ڈالر سے تجاوز کر چکا ہے اور بھارت چین کی مصنوعات کے لیے پاکستان سے کئی گنا بڑی منڈی ہے۔دونوں ممالک برکس بینک کے بنیادی ممبران ہیں جو بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کرنے کی جانب بڑھ رہے ہیں۔اسی طرح دونوں ممالک سی پیک طرز کے BCIM (بنگلہ دیش چین انڈیا میانمار) منصوبے پر بھی کام کر رہے ہیں گو کہ اس میں سی پیک جیسی تیزی دیکھنے میں نہیں آئی۔اس منصوبے کے تحت چین کے صوبے یونان کے دارالحکومت کنمنگ کو 2800 کلومیٹر طویل سڑکوں کے ذریعے کولکتہ کے ساتھ جوڑا جائے گا تاکہ وہ سمندر تک رسائی حاصل کر سکے۔ یہ سڑک مغربی بنگال میں کولکتہ سے شروع ہو کر بینا پول کے مقام پر بنگلہ دیش میں داخل ہو گی اور سلہٹ اور ڈھاکہ سے ہوتے ہوئے آسام سے دوبارہ بھارت میں داخل ہو گی۔اس کے بعد یہ بھارت کی مختلف مشرقی ریاستوں سے گزرتے ہوئے میانمار میں داخل ہو گی اور وہاں سے چین کے صوبے یونان پہنچے گی۔اس منصوبے میں پیش رفت نہ ہونے کی بڑی وجہ اروناچل پردیش کے متنازعہ علاقے سمیت اس خطے میں جاری بہت سے دیگر تنازعات ہیں۔اروناچل پردیش بھارت اور چین کے درمیان ماضی میں جنگ کا باعث بھی بن چکا ہے۔چینی صدر نے بنگلہ دیش میں اپنے

حالیہ دورے میں اس منصوبے کا ذکر کیا تھا۔اس کے علاوہ بنگلہ دیش میں انرجی کے بڑے منصوبے شروع کیے جا رہے ہیں۔اس حوالے سے بھارت کے تین ہمسایہ ممالک پاکستان، سری لنکا اور بنگلہ دیش میں چین اپنے قدم جما رہا ہے۔

اس خطے کے علاوہ بھی چین پوری دنیا میں ابھرتی ہوئی ایک سامراجی قوت ہے اور امریکی سامراج کو چیلنج کر رہا ہے۔چین کے بینک آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کا مقابلہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔لیکن یہاں اہم سوال یہ ہے کہ کیا چین مستقبل میں امریکی سامراج کی جگہ لے سکتا ہے؟ یا پھر یہ کہ چینی سامراج ماضی کی سامراجی قوتوں کی طرح کا کوئی کردار ادا کر سکتا ہے یا نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ چین ایک ایسے وقت میں سامراجی قوت بن کر ابھر رہا ہے جب سرمایہ دارانہ نظام ایک بدترین بحران کا شکار ہے۔اور خود چین کی معیشت زوال کا شکار ہے۔اس کے علاوہ چین کسی انقلاب کے بعد سرمایہ دارانہ ترقی کی منازل طے کرتا ہوا سامراجی قوت نہیں بن رہا بلکہ چین ایک بہت بڑے ردانقلاب کے نتیجے میں یہ کردار اپنانے جا رہا ہے۔ماضی میں جتنی بھی سامراجی قوتیں ابھری ہیں ان کے پیچھے سرمایہ دارانہ انقلابات موجود تھے۔برطانوی، فرانسیسی، امریکی، ہسپانوی، ولندیزی یا پرتگیزی سامراجی قوتوں کے پیچھے بہت بڑے پیمانے پر سرمایہ دارانہ انقلابات موجود تھے جنہوں نے جاگیردارانہ نظام اور ان پر مسلط مطلق العنان بادشاہتوں کا خاتمہ کر کے ایک نئے نظام کا آغاز کیا۔ہندوستان پر برطانوی غلبے کے پیچھے بھی یہی قوت کارفرما تھی اور اٹھارویں اور انیسویں صدی میں برطانوی سرمایہ داری ترقی پسندانہ کردار ادا کر رہی تھی۔

برطانوی سامراج نے یہاں سرمایہ داری کی بنیادیں فراہم کیں۔برطانوی سامراج کے بعد امریکی سامراج نے پوری دنیا پر اپنا غلبہ قائم کیا۔دوسری عالمی جنگ کے بعد بہت سے تباہ حال ممالک میں امریکی سامراج نے سوویت یونین اور چین کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے سرمایہ دارانہ بنیادوں پر جدید سماج اور مضبوط ریاستیں تعمیر کیں۔مشرقِ بعید میں چین کی سرخ آندھی کو روکنے کے لیے جاپان، جنوبی کوریا اور تائیوان میں جدید سرمایہ دارانہ بنیادوں پر سماج کو از سرِ نو تعمیر کیا گیا اور اہم صنعتیں تعمیر کیں۔یہ ممالک آج بھی امریکی سامراج کے زیرِ تسلط ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہاں معیارِ زندگی اور ذرائع پیداوار کی کیفیت کا مغرب کے جدید سرمایہ دارانہ ممالک سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔اسی طرح سوویت یونین کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے سکینڈے نیویا میں فلاحی ریاستیں قائم کی گئیں جبکہ مغربی جرمنی کا مارشل پلان بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں جب

ہنگامی بنیادوں پر مغربی جرمنی کو دوبارہ سرمایہ دارانہ بنیادوں پر استوار کیا گیا۔لیکن اس وقت عالمی جنگ کی تباہ کاری کے باعث سرمایہ داری کے پاس اتنی گنجائش موجود تھی کہ وہ یہ سب اقدامات کر سکے۔آج عراق، افغانستان سمیت امریکی سامراج کہیں بھی یہ کردار ادا کرنے کے قابل نہیں بلکہ پہلے سے موجود ریاستوں کو کمزور کر رہا ہے۔خود امریکی معیشت شدید بحران کا شکار ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ نے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک جیسے عالمی مالیاتی سامراجی ادارے بھی قائم کیے جنہوں نے براہ راست نوآبادکاری کے بجائے دنیا کے مختلف ممالک میں مالیاتی پالیسیوں کے ذریعے سامراجی تسلط قائم کیا۔اس دوران سرمایہ دارانہ بنیادوں پر معاشی ترقی کے باعث سرمایہ داری میں یہ گنجائش موجود تھی کہ اتنے مضبوط مالیاتی نظام کو قائم کیا جا سکے۔

لیکن کیا چینی سامراج اب کوئی ترقی پسندانہ کردار ادا کر سکتا ہے یا سڑکوں اور ریلوے لائنوں کے یہ منصوبے برطانوی سامراج کے منصوبوں سے مشابہت رکھتے ہیں؟قطعی طور پر ایسا نہیں۔ چین سمیت پوری دنیا میں آج سرمایہ داری کوئی بھی ترقی پسندانہ کردار ادا کرنے سے قاصر ہے اور ذرائع پیداوار کی ترقی میں خود ایک بہت بڑی رکاوٹ بن چکی ہے۔کسی بھی حوالے سے چینی سامراج پاکستان یا خطے میں ترقی پسندانہ کردار ادا نہیں کر سکتا اور نہ ہی یہاں پرولتاریہ کی قوتوں کو مضبوط کر سکتا ہے۔چینی سامراج نامیاتی کمزوری اور خصی پن کا شکار ہے۔چین کا حکمران طبقہ کسی انقلاب کے ذریعے برسر اقتدار نہیں آیا بلکہ منصوبہ بند معیشت کو ایک ردانقلاب کے ذریعے منڈی کی معیشت میں تبدیل کیا گیا۔انقلاب کے بعد برسر اقتدار آنے والے حکمران طبقے میں جو اعتماد ہوتا ہے وہی اسے آگے بڑھنے کا عزم اور حوصلہ دیتا ہے اور نئی منزلوں کی جانب گامزن کرتا ہے۔ چین کا حکمران طبقہ چور رستوں سے اقتدار میں آیا ہے اور اس وقت دنیا کا بدعنوان ترین حکمران طبقہ ہے جس کے اہم عہدیدار اربوں ڈالر کی بدعنوانی میں ملوث ہیں۔ایسے چوروں سے کسی ترقی پسند کردار کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔اس کے علاوہ چین کی تمام تر ترقی مغربی سرمایہ دارانہ ممالک کی جدید تکنیک کی مرہون منت ہے۔اسلحہ سازی کا میدان ہو یا خلائی تحقیق کا، ہر جگہ چین کی تکنیک امریکہ اور دیگر ممالک کے مقابلے میں انتہائی پسماندہ ہے۔یہاں تک کہ روس کے پاس چین سے زیادہ جدید تکنیک موجود ہے۔چین میں سوشلسٹ انقلاب کی کامیابی کے بعد بہت جلد سوویت یونین اور چین کی بیوروکریسی کے تضادات ابھر گئے تھے اور دونوں متحارب قوت کے طور پر سامنے آئے تھے۔اس لیے سوویت یونین میں ہونے والی تکنیک کی ترقی بھی چین کو منتقل

نہیں کی جاسکی تھی۔گزشتہ دو دہائیوں میں چین میں جدید صنعت کے آنے کے باوجود ڈیزائننگ اور سائنسی تحقیق پر امریکی اور یورپی کمپنیوں کی اجارہ داری قائم ہے۔اس تکنیک تک چین کی تاخیر زدہ سرمایہ داری نہیں پہنچ سکتی اس لیے سرمایہ دارانہ بنیادوں پر ان مغربی سامراجوں کا دم چھلا بن کر ہی رہ سکتی ہے۔اس حوالے سے چینی سامراج امریکی سامراج سے کوئی آگے کا قدم نہیں بلکہ امریکی سامراج اور سرمایہ داری کے زوال کے باعث ہونے والی شکست وریخت میں عالمی سطح پر اپنا کردار تلاش کرتی ہوئی ایک قوت ہے۔

اسی حوالے سے پاکستان میں چینی سرمایہ کاری کوئی ترقی اور خوشحالی لانے والی نہیں۔جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ اس منصوبے کی تکمیل سے یہاں نئی صنعتیں لگنے کی بجائے پہلے سے موجود صنعتیں تباہ ہوں گی اور بیروزگاری میں اضافہ ہوگا۔اس منصوبے سے ذرائع نقل وحمل میں جو بہتری آئے گی اس سے کسی بھی قسم کی تکنیک یا ہنر کی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی یا فراوانی کی کوئی گنجائش نہیں۔اسی طرح غربت اور بیروزگاری میں کسی صورت میں کمی آنے والی نہیں۔چین کی تیز ترین شرح ترقی کے باوجود چین کے اندر غربت اور بیروزگاری میں اضافہ ہوا ہے۔عالمی سطح پر سرمایہ داری کا موجودہ عہد میں یہی کردار ہے۔60-1950ء کی دہائیوں کے برعکس آج سرمایہ داری کی تمام تر ترقی مینوفیکچرنگ کی بجائے صرف مالیاتی شعبے کی مرہون منت ہیں۔اس سے نہ تو وسیع بنیادوں پر روزگار کے مواقع پیدا ہوتے ہیں اور نہ ہی حقیقی اجرتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔بلکہ ان پالیسیوں سے دولت کم سے کم ہاتھوں میں تیزی سے مرتکز ہوتی چلی جاتی ہے۔اسی باعث آبادی کی اکثریت کا معیار زندگی گرتا چلا جاتا ہے جس کا عملی نمونہ خود چین میں نظر آتا ہے۔یہی صورتحال چینی سرمایہ کاری پاکستان میں پیدا کرے گی۔جس کے نتیجے میں غربت، بیروزگاری اور معاشی بدحالی میں شدید اضافہ ہوگا اور آبادی کا مزید بڑا حصہ غربت کی دلدل میں دھنستا چلا جائے گا جبکہ حکمران طبقے کے افراد کی دولت میں تیزی سے اضافہ ہوگا۔

اس تمام تر منصوبے کا واحد ترقی پسند پہلو یہی ہے کہ چین اور پاکستان کے محنت کش طبقے کی جڑت تاریخ میں پہلی دفعہ بڑھے گی۔پہلے ہی ہزاروں چینی محنت کش پاکستان میں مختلف منصوبوں پر کام کر رہے ہیں۔آنے والے دنوں میں اس میں اضافہ ہوگا۔چین کے محنت کش اس کے ساتھ اپنی انقلابی روایات کو بھی لائیں گے اور چین میں ہڑتالوں کے بڑھتے ہوئے طوفان یہاں بھی اثرات مرتب کریں گے۔جہاں ان کمپنیوں کی لوٹ مار اور استحصال بڑھے گا وہاں اس استحصال

کے خلاف محنت کش طبقے کی مشترکہ جدوجہد اور مزاحمت کے واقعات بھی دیکھنے کو ملیں گے جو دنیا کے سب سے بڑے پرولتاریہ کے ساتھ پاکستان کے محنت کش طبقے کو جوڑیں گے۔ ہندوستان کا محنت کش طبقہ پہلے ہی تاریخ کی سب سے بڑی ہڑتال کر کے طبقاتی جنگ کا بگل بجا چکا ہے۔ مارکسیوں کو ایک ایسی کیفیت کا خواب ضرور دیکھنا چاہیے جہاں ہندوستان، پاکستان اور چین کے محنت کش ایک مشترکہ ہڑتال کی جانب بڑھیں اور سامراج کی مصنوعی سرحدوں کو پامال کرتے ہوئے خطے میں سرمایہ داری کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکیں۔ اس خواب کی تعبیر کے لیے سائنسی بنیادوں پر جدوجہد کرنا ہر مارکسی کا فریضہ ہے۔

سیاسی مضمرات

سی پیک نے پاکستان کی سیاست کو شدید متاثر کیا ہے۔ ایک طرف امریکہ اور چین کے باہمی تضادات ریاست کے پہلے سے برسرِ پیکار دھڑوں کو مزید شدت سے بھڑکا رہے ہیں تو دوسری جانب سویلین اور فوجی حکمران ایک دوسرے کیخلاف سازشیں کرنے میں مصروف ہیں۔ پاکستان کے تمام قوم پرستوں کو بھی کالاباغ ڈیم کے بعد ایک نیا ایشو ہاتھ لگا ہے اور وہ اس پر اعتراضات اٹھا کر اپنی مرتی ہوئی سیاست کو زندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس وقت پاکستان میں ہونے والے ہر واقعے کو کسی نہ کسی طرح سی پیک سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ خواہ کوئٹہ میں کوئی بم دھماکہ ہو یا تحریک انصاف کا کوئی جلسہ، اس وقت پاکستان کے تمام مسائل کا رخ سی پیک کی جانب ہے۔ لیکن جہاں بہت سے فروعی بیانات اور غیر ضروری ایشوز کو ابھارا جا رہا ہے وہاں کچھ تلخ حقائق بھی موجود ہیں۔

بلوچستان جس کی بندرگاہ کے گرد سارا منصوبہ بنایا گیا ہے وہاں اس منصوبے کا سب سے کم حصہ خرچ کیا جائے گا۔ 51.5 ارب ڈالر میں سے صرف 600 ملین ڈالر بلوچستان میں خرچ کیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ منصوبے کے بہت سے اخراجات بلوچستان کی حکومت کے ذمے ہیں۔ گو کہ سرمایہ دارانہ بنیادوں پر بلوچستان کو کسی بھی طریقے سے خوشحال نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی جدید سرمایہ دارانہ سماج تعمیر ہو سکتا ہے لیکن اس منصوبے میں اخراجات کے فرق نے پہلے سے موجود قومی محرومی کے جذبات کو مزید بھڑکایا ہے۔ ملک کے تمام قوم پرست راہنماؤں کے لیے یہ صورتحال کسی تحفے سے کم نہیں اور خود ریاست اس منصوبے کی آڑ میں ان تعصّبات کو محنت کشوں کو

مزید تقسیم کرنے کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ گلگت بلتستان میں اس حوالے سے ایک حقیقی تحریک بھی موجود ہے جس نے اس منصوبے کو چیلنج کیا ہے۔ جبکہ پختون قوم پرست بھی روٹ کی تبدیلی کے لیے سیاست کا آغاز کر چکے ہیں۔ اس تمام تر سیاست میں بنیاد یہی بنائی گئی ہے کہ اس منصوبے کے ذریعے ترقی اور خوشحالی آئے گی اور مظلوم قومیتوں کو اس خوشحالی سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہ منصوبہ مزید معاشی بربادی اور غربت پھیلانے کا موجب بنے گا۔ جبکہ امریکہ اور چین کے سامراجی تضادات کے نتیجے میں یہ منصوبہ یہاں خون کی ندیاں بہانے کا باعث بنے گا۔ انہی تضادات میں پاکستان کی لڑکھڑاتی ریاست مزید کمزور ہو کر بکھرنے کی طرف جائے گی جس کے باعث سماجی انتشار میں اضافہ ہوگا۔ اسی انتشار میں ریاست قومی، لسانی، فرقہ وارانہ، مذہبی اور علاقائی تعصّبات کو زیادہ گھناؤنے طریقے سے استعمال کرنے کی کوشش کرے گی۔ ایران اور ہندوستان کی مداخلت عدم استحکام کو مزید گہرا کرے گی۔ اس باعث یہ منصوبہ حکمرانوں کے دودھ اور شہد کی نہریں بہانے کے دعووں کے برعکس خون اور دکھوں کی نہریں بہائے گا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جس علاقے میں تھانہ بن جائے وہاں جرائم کا آغاز ہو جاتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے اتنی بڑی فوج اور اس کے جرنیلوں کی مراعات کی موجودگی میں مسئلہ کشمیر حل نہیں ہو سکتا۔ اسی پس منظر میں بارہ ہزار افراد پر مشتمل سکیورٹی فورس کے بن جانے سے سی پیک کی سکیورٹی کے خدشات کیسے ختم ہو سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ پاکستانی ریاست اور سیاست کا مستقل عدم استحکام بھی موجود ہے جو مختلف تعصّبات کو ابھارتا رہے گا اور سی پیک اس فروعی سیاست کے لیے ایک موزوں ہدف ہے۔

لیکن اس دوران چین کا پاکستان پر سامراجی غلبہ بڑھے گا اور پاکستان کی سیاست میں وقت کے ساتھ ساتھ چین کا ایک اہم فریق کے طور پر کردار بڑھے گا۔ پہلے پاکستان کی سیاست کے اہم فیصلے واشنگٹن سے کیے جاتے تھے خواہ مارشل لا ہو یا جمہوریت۔ گزشتہ کچھ سالوں میں سعودی عرب کا اثر ورسوخ بھی بڑھا ہے۔ لیکن اب چین کا اثر ورسوخ موجود ہے اور آنے والے عرصے میں اس میں اضافہ ہوگا۔ بیجنگ پاکستان کی مختلف سیاسی پارٹیوں کی پشت پناہی سے اپنے مفادات کے تحفظ کو یقینی بنائے گا۔ اس عمل میں اس کا امریکہ اور دیگر قوتوں سے ٹکراؤ بنے گا جو سیاست کی نئی تشکیلات اور ٹوٹ پھوٹ کا باعث بن سکتا ہے۔ اس کے علاوہ چین کو امریکہ پر یہ فوقیت بھی حاصل ہے کہ اس کی سرحد پاکستان سے جڑی ہوئی ہے۔ یہاں اپنی سرمایہ کاری اور سامراجی

مفادات کے تحفظ کے لیے چین زمینی رستے کو کسی بھی طور استعمال کر سکتا ہے۔ اول تو گوادر میں بحری اڈہ بنانے کی جانب پیش رفت چین کے حقیقی سامراجی عزائم کو بے نقاب کرے گی۔ لیکن یہ عزائم جہاں امریکہ اور بھارت سے ٹکرائیں گے وہاں خود پاکستانی ریاست اور فوج کے بہت سے حصے چین کی اس براہ راست غلامی کو خوش دلی سے قبول نہیں کریں گے اور اپنی نسبتاً آزادانہ حیثیت برقرار رکھنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن چین کے پاس اس سے نپٹنے کے وسائل موجود ہیں۔ ایسے میں امریکی مداخلت کم ہونے کی بجائے بڑھے گی کیونکہ امریکی یہاں ریاست کے مختلف حصوں میں ایک لمبے عرصے سے موجود ہیں اور گہرائی میں سرایت کر چکے ہیں۔ انہی تضادات کے باعث ریاست کے مختلف دھڑے زیادہ شدت کے ساتھ آپس میں ٹکراؤ میں آئیں گے۔

اس تمام تر سامراجی کھلواڑ میں محنت کش عوام کی زندگیاں مزید تلخ ہوتی جائیں گی۔ گوادر کے عوام پہلے ہی اس منصوبے کے نتیجے میں در بدر ہو رہے ہیں اور انہیں اپنے گھروں میں جانے کے لیے خصوصی اجازت نامے کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہی حال بلوچستان کے باقی علاقوں کا ہے۔ پنجاب کے جن علاقوں سے موٹروے گزرے گی وہاں بھی خوشحالی کا کوئی امکان نہیں۔ دو دہائیاں قبل بننے والی لاہور اسلام آباد موٹروے کے ساتھ بسنے والی بیشتر آبادیوں میں آج بھی بھوک اور افلاس کا دور دورہ ہے اور دنیا کی جدید ترین سڑک ہونے کے باوجود وہاں لوڈ شیڈنگ اور ہزاروں سال پرانی گدھا گاڑی ختم نہیں ہو سکی۔ سی پیک کے انرجی کے منصوبوں کے بعد لوڈ شیڈنگ میں مزید اضافہ ہوگا اور بجلی کی سہولت عوام کی اکثریت سے دور چلی جائے گی۔ اسی طرح دیگر بنیادی ضروریات تک رسائی بھی مشکل ہوتی چلی جائے گی۔ اس منصوبے کے تباہ کن اثرات کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے خلاف طبقاتی بنیادوں پر صف بندی کی جائے۔ محنت کشوں کو اس کی حقیقت سے آگاہ کرتے ہوئے انہیں اس کیخلاف ایک تحریک میں منظّم کیا جائے۔ لوٹ مار کے اس منصوبے سے نجات صرف ایک سوشلسٹ انقلاب کے بعد سرمایہ داری کے مکمل خاتمے کے ذریعے ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ جب تمام ذرائع مواصلات اور ذرائع پیداوار مزدوروں کے جمہوری کنٹرول میں ہوں اور انہیں منافع خوری کی بجائے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کیا جائے۔

5۔سماجی انتشار

معاشی بدحالی اور حکمران طبقے کی لوٹ مار نے اس سماج کو ایک جہنم بنا دیا ہے۔ حالت یہ ہو چکی ہے کہ پینے کا صاف پانی بھی ملک میں دستیاب نہیں اور اگر صاف پانی پینا مطلوب ہو تو خرید کر پینا پڑتا ہے۔ گو خریدے ہوئے پانی کے بھی صاف ہونے کی کوئی گارنٹی نہیں۔ صحت، تعلیم اور دیگر بنیادی سہولیات عوام کے بڑے حصے کی پہنچ سے دور ہو چکی ہیں اور اس دوری میں مزید اضافہ ہو رہا ہے۔ بنیادی انفرا اسٹرکچر شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے اور عوام کو مسلسل اذیت میں مبتلا کر رہا ہے۔ ہر سال ٹریفک حادثات میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ایک بے ہنگم پن ہے جو سماج کے ہر حصے میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ اخلاقیات میں شدید گراوٹ آ چکی ہے۔ منافقت، گالم گلوچ، دھوکہ دہی اور ذہنی تناؤ روزمرہ کا حصہ بن چکے ہیں۔ معاشی مشکلات سے دوچار رہنے کے باعث آبادی کا ایک بڑا حصہ مسلسل ذہنی دباؤ کا شکار رہنے کے بعد مریض بن چکا ہے۔ جھگڑے، خاندانی ٹوٹ پھوٹ اور لڑائیاں روزمرہ کا معمول بن چکی ہیں۔ بیروزگاری کے عفریت کے بڑھنے کے باعث جرائم اور منشیات کے استعمال میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد متبادل نہ ہونے کے باعث اس دلدل میں پھنستی چلی جا رہی ہے اور انہیں یہاں سے نکالنے والا کوئی نہیں۔ ریاستی اداروں کی ناکامی ہر جگہ عوام کا منہ چڑاتی ہے۔ سیوریج کے ناقص نظام سے لے کر پولیس کی غنڈہ گردی تک ہر ریاستی ادارہ بذات خود عوام کے لیے اذیت کا باعث بن چکا ہے۔ اس ملک میں کسی بھی سرکاری ادارے میں کسی مسئلے کے حل کے لیے جانا خود ایک بہت بڑا مسئلہ بن چکا ہے۔ پارکنگ کی فیس سے لے کر رشوت اور سفارش کے گھن چکر میں ایک معمولی سا مسئلہ کسی پہاڑ کی چوٹی سر کرنے کے برابر اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ پورے کا پورا سماجی معاشی نظام جہاں تباہی اور بربادی کا شکار ہو اور اس کی بنیادیں ہی بوسیدہ ہو کر گر رہی ہوں وہاں خاندان کا ادارہ کیسے صحت مند رہ سکتا ہے۔ قریبی ترین رشتوں میں بھی ضروریات اور پیسہ سرایت کر چکے ہیں۔ غرض کے پورا سماجی ڈھانچہ ایک متعفن لاش بن چکا ہے جسے اگر وقت پر دفن نہ کیا گیا

تو یہ ہر آنے والے دن کے ساتھ مزید بدبودار ہوتا چلا جائے گا۔ اس کی یہ سڑاند ہر شخص کو بیمار کرتی جائے گی اور انسانی تہذیب کے لیے زہر قاتل ثابت ہوگی۔

خواتین

کسی بھی سماج کی حالت کا اندازہ وہاں موجود خواتین کی حالت سے لگایا جا سکتا ہے۔ حال ہی میں شائع ہونے والی ورلڈ اکنامک فورم کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ خواتین کے حالات کے حوالے سے پاکستان دنیا کے 144 ممالک میں سے 143 ویں نمبر پر ہے۔ 2006ء میں یہ ملک 112 ویں نمبر پر تھا اور اس وقت سے اب تک خواتین کی حالت بہتر ہونے کی بجائے بدتر ہوئی ہے۔ اس رپورٹ میں صحت کی سہولیات، خواندگی، روزگار کے مواقع اور اجرتوں میں فرق اور سیاسی حقوق کے حوالے سے اعداد و شمار اکٹھے کیے جاتے ہیں اور ان سے خواتین کی حالت زار کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ اس ملک میں خواتین کے لیے موجود صحت کی سہولیات میں مسلسل کمی ہوتی جا رہی ہے۔ صرف چھاتی کے کینسر سے چالیس ہزار خواتین ہر سال ہلاک ہو جاتی ہیں۔ زچگی کے دوران ہلاک ہو جانے والی خواتین کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ہر ایک لاکھ خواتین میں سے اوسطاً 178 خواتین زچگی کے دوران ہلاک ہو جاتی ہیں جبکہ زیادہ سے زیادہ ہلاکتوں کی تعداد 283 تک جا سکتی ہے۔ بلوچستان میں یہ تعداد سب سے زیادہ ہے جہاں ہر ایک لاکھ میں سے 996 خواتین ہلاک ہوتی ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق ہر 37 منٹ بعد ایک خاتون اس باعث ہلاک ہو جاتی ہے۔ خواتین کی بہت بڑی تعداد دیگر قابل علاج بیماریوں سے ہلاک ہو جاتی ہے اور انہیں ہسپتال لیجانے کی بجائے قبرستان ہی جانے کا موقع ملتا ہے۔ تعلیم کے مواقع بھی خواتین کے لیے مسلسل سکڑ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر سال بڑی تعداد میں خواتین کو رسوم و رواج کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔

سماج کی پسماندگی اور بحران کا سب سے زیادہ نشانہ خواتین بنتی ہیں۔ وہ اس سماج میں دہرے جبر کا شکار ہیں جہاں ایک طرف انہیں معاشی مشکلات اور بحرانوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہاں انہیں جنسی تفریق کا جبر بھی زندگی کے ہر قدم پر برداشت کرنا پڑتا ہے۔ سماج کی گراوٹ کی حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ الٹراساؤنڈ جیسی جدید تکنیک کا استعمال گھناؤنے مقاصد کے لیے کیا جاتا ہے۔ پیدائش سے پہلے ہی بچے کی جنس کا پتہ چلا کر لڑکی ہونے کی صورت میں اسقاط حمل کرا دیا جاتا ہے۔

عورت ہونا ایک جرم بن چکا ہے اور والدین کے لیے لڑکی کی پیدائش سماج میں شرمندگی کا باعث بن جاتی ہے۔ پاکستان میں اس وقت ہر 105.7 لڑکوں کے مقابلے میں سولڑکیاں ہیں۔ خواتین کی آبادی میں کمی سماجی بحران کی عکاسی کرتی ہے۔ پاپولیشن ریسرچ انسٹیٹیوٹ کی ایک تحقیق کے مطابق 2000ء سے 2014ء کے درمیان پاکستان میں بارہ لاکھ بچوں کا اسقاط حمل اس لیے کروایا گیا کیونکہ وہ لڑکی تھی۔ ان کے مطابق اوسطاً یہ 116,384 سالانہ بنتا ہے۔ اس حوالے سے پاکستان دنیا بھر میں تیسرے نمبر پر آتا ہے، چین میں ہر سال آٹھ لاکھ اور بھارت میں چھ لاکھ حمل انہی بنیادوں پر ضائع کیے جاتے ہیں۔ پیدا ہو جانے والی لڑکیوں کو غذائی قلت سے لے کر ناخواندگی اور علاج کی عدم دستیابی جیسے مسائل کا سامنا ہر قدم پر کرنا پڑتا ہے جہاں جنسی بنیادوں پر تفریق کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ پسماندہ رسوم و رواج کی بھینٹ چڑھنے والی خواتین کی بھی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ 2011ء میں پاکستان میں خواتین پر تیزاب پھینکنے کے ڈیڑھ سو واقعات سامنے آئے جبکہ غیرت کے نام پر قتل کے 720 واقعات منظر پر آسکے ان میں قتل ہونے والی 605 خواتین تھیں۔ زیادہ تر واقعات خاندان کی ملی بھگت سے سامنے ہی نہیں آتے اور اسے بیماری یا کسی دوسری وجہ سے ہلاکت قرار دے کر دبا دیا جاتا ہے۔ پولیس اور دیگر ریاستی ادارے بھی ایسے واقعات میں خاندان کی کھلی مدد کرتے ہیں۔ دو سال قبل ایک خاتون کو ہائی کورٹ کی عدالت کے باہر خاندان والوں نے پسند کی شادی کرنے پر پتھراؤ کر کے قتل کر دیا تھا۔

اس سے بھی زیادہ خواتین پر جبر صنعتوں میں کیا جاتا ہے جہاں اجرتیں انتہائی کم ہیں جبکہ جنسی طور پر ہراساں کرنا یا زیادتی کرنا ایک معمول ہے۔ ورلڈ اکنامک فورم کی مذکورہ رپورٹ میں جنسی بنیادوں پر اجرتوں میں تفریق کے لیے پاکستان میں درکار اعداد و شمار ہی نہیں مل سکے۔ یہاں پر جس طرح صنعتوں کو بغیر کسی مزدور قوانین کی موجودگی کے چلایا جا رہا ہے وہاں سے یہ اعداد و شمار ملنا ممکن ہی نہیں۔ کسی بھی ادارے میں محنت کشوں کا کوئی ریکارڈ نہیں۔ بلدیہ ٹاؤن کراچی کی فیکٹری میں لگنے والی آگ سے ہلاک ہونے والوں کی شناخت ہی نہیں ہو سکی کیونکہ لیبر ڈیپارٹمنٹ سمیت کہیں بھی ان کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں تھا۔ ان ہلاک ہونے والوں میں خواتین اور بچے بھی بڑی تعداد میں شامل تھے۔ رپورٹ کے مطابق محنت کش خواتین اور مردوں کی آمدن کا تناسب 0.23 ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ خواتین کا کتنے بڑے پیمانے پر استحصال ہوتا ہے اور سرمایہ دار خواتین کی سماج میں کم تر حیثیت کو کس طرح اپنے منافعوں میں اضافے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

خواتین کے کام کے اوقات کار بھی زیادہ ہوتے ہیں اور انہیں پر دیگر اقسام کا جبر کرنے کے علاوہ مالکان کے پاس جنسی طور پر ہراساں کرنے کا ہتھیار بھی موجود ہوتا ہے۔ یونین بنانا ویسے ہی ملک میں جرم بن چکا ہے لیکن خواتین کے لیے منظّم ہونا اور اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنا کہیں زیادہ مشکل ہے۔ جہاں انہیں مالکان اور انتظامیہ سے لڑنا پڑتا ہے وہاں انہیں اپنے گھر کی رسوم ورواج کے کیخلاف بھی بغاوت کرنا پڑتی ہے تب ہی وہ کسی احتجاج میں شریک ہوسکتی ہیں۔ لیکن دوسری جانب ہم دیکھتے ہیں کہ خواتین جب کسی لڑائی میں اترتی ہیں تو مردوں سے زیادہ جرات اور دلیری کا مظاہرہ کرتی ہیں جس سے سرمایہ داروں کے دل دہل جاتے ہیں۔ اس سال نرسوں اور خواتین اساتذہ کے ایسے ہی احتجاجی مظاہرے دیکھنے میں آئے جنہوں نے پولیس اور ریاستی اداروں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔

خواتین کو اس سماج میں رسوم ورواج کے جبر کے ساتھ ساتھ ملائیت کا جبر بھی برداشت کرنا پڑتا ہے جو خواتین کو پتھر کے زمانے میں دھکیلنا چاہتے ہیں اور اسے انسان کا درجہ دینے کے لیے تیار نہیں۔ ضیا دور میں بنائے گئے ظالمانہ قوانین آج بھی موجود ہیں جو خواتین کی تذلیل کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ دوسری جانب بڑے پیمانے پر این جی اوز کھمبیوں کی طرح اگ چکی ہیں جنہوں نے خواتین پر ہونے والے مظالم کو ایک کاروبار بنالیا ہے۔ انسانی حقوق کا واویلا کر کے یہ خواتین کے زخموں اور تذلیل کو دنیا بھر میں فروخت کرتے ہیں اور اس سے مال بناتے ہیں۔ ایسے میں خواتین کے مسئلے کو ملائیت اور سرمایہ دارانہ لبرل ازم میں ایک لڑائی بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور اس کے طبقاتی پہلو کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ درحقیقت دونوں فریقین ہی سرمایہ دارانہ نظام کی ازلی اور ابدی حیثیت پر یقین رکھتے ہیں اور مختلف طریقوں سے اس جبر کو جاری رکھنے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ کچھ نام نہاد بائیں بازو کے لوگ اسمبلی کی قراردادوں اور عدالتی فیصلوں کے ذریعے خواتین کے حالات بہتر کرنا چاہتے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسمبلیوں میں ہونے والی قانون سازی سے صرف کوڑے دان کا پیٹ بھرا جا سکتا ہے، اس سے سماج میں رتی بھر بھی تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔ ضرورت اس امر کی ہے خواتین کی آزادی کی جدوجہد کو محنت کش طبقے کی لڑائی سے جوڑا جائے اور اس سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمے کی جدوجہد کی جائے۔ صرف ایک سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے ہی خواتین کی حقیقی آزادی ممکن ہے۔ خواتین کی آزادی سے مراد سب سے پہلے ان کی معاشی آزادی ہے، غربت، بھوک، علاج اور تعلیم کی محرومی سے آزادی ہے۔ صرف

ایک مزدور ریاست ہی انہیں یہ تمام بنیادی سہولیات دے سکتی ہے اور انہیں خاندان کے جبر اور سماج کی پسماندگی سے نجات دلا سکتی ہے۔

صحت

پاکستان میں ریاست صحت پر جی ڈی پی کا صرف 2.2 فیصد خرچ کرتی ہے جو دنیا میں سب سے کم ہے اور اس معمولی رقم کا بھی ایک بہت تھوڑا حصہ صحت عامہ کے انفراسٹرکچر کو بہتر بنانے کے لئے صرف ہوتا ہے جبکہ اس میں بھی مسلسل کمی کی جا رہی ہے۔ ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک میں صحت پر جی ڈی پی کا 10 سے 18 فیصد خرچ کیا جاتا ہے جبکہ ترقی پذیر ممالک میں بھی 5 سے 8 فیصد خرچ کیا جاتا ہے۔ سرکاری ہسپتالوں کی حالت ناگفتہ بہ ہو چکی ہے اور وہاں ایک صحت مند شخص جا کر بھی بیمار ہو سکتا ہے۔ نئی بھرتیاں ایک لمبے عرصے سے نہیں کی جا رہیں اور نہ ہی ضرورت کے مطابق نئے ہسپتال تعمیر کیے جا رہے ہیں۔ جتنے پیسے میٹرو بس اور اورنج ٹرین پر لگائے گئے ہیں اس سے آبادی کے بڑے حصے کو مفت علاج دیا جا سکتا تھا۔ اگر اس کا موازنہ دفاع پر ہونے والے اخراجات سے کیا جائے تو صرف ایک سال کے دفاع کا بجٹ اگر صحت پر خرچ کر دیا جائے تو پورے ملک میں سینکڑوں ہسپتال تعمیر ہو سکتے ہیں اور مفت علاج مہیا کیا جا سکتا ہے۔ حکومت کی انہی پالیسیوں کے باعث علاج سب سے منافع بخش کاروباروں میں شامل ہو چکا ہے۔ امیر افراد کے لیے موجود بڑے نجی ہسپتالوں سے لے کر دیہاتوں میں حکیموں، عطائیوں اور پیروں سے لے کر ہر کوئی علاج کے نام پر مریضوں کو لوٹ رہا ہے۔ دوسری جانب آبادی کا ایک بڑا حصہ اپنی ضروریات میں کمی کر کے اپنے گھر والوں کا علاج کرواتے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ اتنا مہنگا علاج کروانے کے باوجود بھی کسی کو اعتماد نہیں کہ یہ علاج درست ہو رہا ہے یا صرف پیسے اینٹھنے کے لیے اسے غلط علاج بیچا جا رہا ہے۔ اب انشورنس پالیسیوں یا ہیلتھ کیئر سسٹم کے نام پر جو رہا سہا ڈھانچہ سرکاری سطح پر موجود ہے اس کو بھی ختم کیا جا رہا ہے۔

یہ ایک ایسا بدنصیب ملک ہے جہاں آبادی کی ایک بڑی اکثریت علاج کے لیے در در کی ٹھوکریں کھا رہی ہے اور دوسری جانب جونیئر ڈاکٹر بیروزگاری کا شکار ہیں اور روزگار کے حصول کے لیے احتجاج کرنے پر مجبور ہیں۔ بہت بڑے پیمانے پر ڈاکٹر بیرون ملک چلے جاتے ہیں۔ 2009ء کے اعداد و شمار کے مطابق 17 کروڑ کی آبادی کے لیے صرف 127,859 ڈاکٹر

تھے۔جبکہ ڈسپنسریوں اور بنیادی صحت کے مراکز کوملا کرکُل 12,804 ایسی جگہیں سرکاری طور پر موجود ہیں جہاں سے علاج کرایا جا سکتا ہے۔ان کی بھی نجکاری کی جارہی ہے جہاں ہسپتالوں کی جگہ پلازے اور دکانیں بنادی جائیں گی عوام کی اکثریت کوتڑپ تڑپ کرمرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے گا۔

سرکاری سطح پرصحت کے شعبے کی تباہی کے باعث خیراتی ہسپتالوں کا کاروبار بھی عروج پر ہے۔ محنت کشوں کوعلاج جیسی بنیادی سہولت، جوان کا بنیادی حق ہے، خیرات اور بھیک کی شکل میں دی جاتی ہے۔اس کا حقیقی مقصد ظالم سرمایہ داروں اور حکمران اشرافیہ کے خونی چہرے پرنقاب ڈالنا ہے۔ یہاں کے سرمایہ دار مزدوروں کی اجرتیں پوری ادانہیں کرتے، نہ ہی ٹیکس دیتے ہیں لیکن ہسپتالوں میں چندہ دے کرغریبوں کی ہمدردی کا ناٹک کرتے ہیں۔فلاحی اداروں کا کاروبار بھی انہی اشرافیہ کے چندے پرخوب چمک رہا ہے اور دن دگنی رات چگنی ترقی کر رہا ہے۔ یہ فلاحی ادارے ریاست کی ذمہ داری خود ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اتنے زیادہ فلاحی ادارے کھلنے کے باوجود بغیر علاج کے مرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔عمران خان خیرات کے اس نظریے کو پروان چڑھانے میں سرفہرست ہے جو پشاور میں برسراقتدار ہونے کے باوجود وہاں کینسر کا خیراتی ہسپتال بنوا رہا ہے۔یعنی عوام کے ٹیکسوں کا پیسہ لوٹ مار کی نظر کیا جا رہا ہے اور سرکاری ہسپتالوں کو بیچا جارہا ہے جبکہ خیرات کے پیسے سے ہسپتال بنانے کا ناٹک کیا جارہا ہے۔اگر عوام کے علاج سے کسی کو دلچسپی ہوتی تو تمام نجی ہسپتالوں کوسرکاری تحویل میں لے کروہاں علاج کو مفت قرار دے دیا جاتا اورامیروں کی دولت پرٹیکس لگا کراس خرچے کو پورا کیا جاتا لیکن اس نظام کی حدود و قیود میں رہ کرسیاست کرنے والے اس قسم کی چھوٹی سی اصلاح کا قدم بھی نہیں اٹھا سکتے۔ خیراتی علاج اور دیگر بنیادی ضروریات فراہم کرنے والے ایک اورشخص کومرنے کے بعد ہیروقرار دیا گیا جبکہ حقیقت میں وہ ریاست کی ناکامی کا منہ بولتا ثبوت تھا جواس نظام کے گھناؤنے چہرے پرنقاب ڈالنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔عوام کوعلاج کی سہولت دینے کے لیے امیروں سے خیرات اکٹھی کرنے کی بجائے ان کی تمام تر دولت اور جائدادیں ضبط کرنے کی ضرورت ہے۔جنہیں مزدوروں کے جمہوری کنٹرول میں لے کران کوصحت کی سہولیات کی ہرکسی کومفت فراہمی کے لیے استعمال کرنا ہوگا۔ایسا صرف سوشلزم میں ہی ہوسکتا ہے۔

ہسپتالوں کی عدم دستیابی کے علاوہ جعلی ادویات کا کاروبار بھی عروج پر ہے جبکہ دوائیوں کی

قیمتیں بھی بے لگام ہیں۔ حکومت پنجاب کے مطابق بازار میں پندرہ فیصد دوائیاں جعلی ہیں جبکہ 2010ء میں اس وقت کے وزیر داخلہ رحمان ملک نے اسمبلی میں بتایا تھا کہ بازار میں ملنے والی 45 سے 50 فیصد ادویات جعلی ہیں۔ یہاں ادویات کا معیار جانچنے کے لیے قائم لیبارٹریاں ہی معیار کے مطابق نہیں اور نہ ہی کسی کو ان کو بہتر کرنے میں دلچسپی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آئے روز جعلی ادویات کے باعث ہلاکتیں ہوتی رہتی ہیں لیکن کبھی کسی کو سزا نہیں دی گئی۔

ان تمام ادویات کی قیمتوں میں اضافہ بھی روزمرہ کا معمول بن چکا ہے۔ گزشتہ چند ماہ میں ادویات کی قیمتوں میں 100 فیصد اضافہ کر دیا گیا۔ اس سے پہلے بھی کئی اضافے کیے گئے ہیں۔ ان میں فوری جان بچانے والی ادویات بھی شامل ہیں۔ نیوروبیان کے انجکشن کی قیمت مئی میں تین سو روپے تھی جو جون میں 555 روپے کر دی گئی۔ اسی طرح 53 روپے کا No-spa کا ملنے والا گولیوں کا پتہ 144 روپے کا کر دیا گیا۔ ڈرگ ریگولیٹری اتھارٹی ادویہ ساز کمپنیوں کے دباؤ کے تحت تقریباً ہر ماہ کسی نہ کسی شکل میں ادویات کی قیمتوں میں اضافے کی اجازت دے رہی ہے۔ اس کے علاوہ کمپنیاں دیگر طریقوں سے بھی لوٹ مار کرتی چلی جا رہی ہیں جس کو روکنے والا کوئی نہیں۔ ایسے میں علاج کی سہولت اس ملک کی آبادی کے جس قلیل حصے کے پاس رہ گئی ہے اس سے بھی چھنتی جا رہی ہے۔ اپنے اور اپنے خاندان کے دیگر افراد کو علاج کی سہولیات دلانے کے لیے بھی اس ملک میں ایک سوشلسٹ انقلاب کی ضرورت ہے ورنہ سرمایہ داری میں تو کفن بھی مہنگا ہوتا جا رہا ہے۔

تعلیم

علاج کی طرح تعلیم کی سہولت بھی عوام سے چھینی جا رہی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ حکومت تعلیم کا محکمہ ہی ختم کرنے جا رہی ہے اور عوام کو مکمل طور پر نجی اداروں کی لوٹ مار کے لیے چھوڑنے کے درپے ہے۔ تعلیمی اداروں کی نجکاری کا عمل بڑے پیمانے پر تمام صوبوں میں جاری ہے۔ پنجاب میں پچاس ہزار سے زائد سرکاری سکولوں کی نجکاری کا اعلان کیا جا چکا ہے جس کے خلاف اساتذہ کا احتجاج جاری ہے۔ اس کے علاوہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے بجٹ میں بھی مسلسل کٹوتی کی جا رہی ہے اور انہیں نجکاری کی جانب دھکیلا جا رہا ہے۔ اسی باعث تعلیم ایک منافع بخش کاروبار بن چکی ہے جس میں نہ صرف فیس کے ذریعے بڑے پیمانے پر رقم بٹوری جاتی ہے بلکہ بدلے میں انتہائی

غیر معیاری تعلیم بھی دی جاتی ہے جس کو پوچھنے والا کوئی نہیں۔ نجی اداروں میں اساتذہ کا استحصال بھی بڑھتا جا رہا ہے اور ان کی اجرتوں میں مسلسل کمی کی جا رہی ہے جبکہ کام کے اوقات کار بڑھتے جا رہے ہیں۔ سرکاری تعلیمی اداروں کے اساتذہ سے بھی الیکشنوں سے لے کر ڈینگی مچھر کے خاتمے تک ہر قسم کے کام لیے جاتے ہیں جبکہ تعلیم کا معیار گرتا جا رہا ہے۔

پاکستان میں تعلیم پر گزشتہ 45 سالوں میں جی ڈی پی کا اوسطاً 2.32 فیصد (ملازمین کی تنخواہوں سمیت) سالانہ خرچ کیا گیا ہے جو دنیا کے دیگر ممالک کے مقابلے میں انتہائی کم ہے۔ آبادی کی ضرورت کے مطابق نئے تعلیمی ادارے تعمیر کرنے کی بجائے پہلے سے موجود اداروں کو بند کیا جا رہا ہے یا انہیں نجی شعبے میں دیا جا رہا ہے۔ پاکستان میں اس وقت خواندگی کی شرح 60 فیصد ہے جو کہ سراسر جھوٹ پر مبنی ہے۔ اس کے لیے خواندگی کی تعریف کو ہی تبدیل کیا جا چکا ہے جبکہ اس کے باوجود بھی اس میں جھوٹ کا عنصر شامل ہے۔ اس کے باوجود پاکستان میں ناخواندہ افراد کی تعداد آبادی کے تناسب سے دنیا میں تقریباً سب سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ سکول نہ جانے والے بچوں کی تعداد میں پاکستان دوسرے نمبر پر آتا ہے جہاں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 51 لاکھ بچے سکول نہیں جاتے۔ حقیقی تعداد اس سے زیادہ ہے اور خواتین میں تو ناخواندگی کی شرح کہیں زیادہ ہے۔

تعلیم کی عدم دستیابی کے ساتھ ساتھ اس کے معیار میں بھی مسلسل کمی آتی جا رہی ہے۔ ایک طرف مدرسوں کا جال بڑھتا جا رہا ہے جس میں لاکھوں بچوں کو ملاؤں کے مفادات کی بھینٹ چڑھنے کے لیے تیار کیا جاتا ہے اور دوسری جانب نجی اداروں کی منافع خور پالیسیوں کے تحت معیار سے زیادہ بھونڈے دکھاوے کو فوقیت دی جاتی ہے۔ نصاب میں بھی ایسی تبدیلیاں کی جا رہی ہیں جن سے مذہبی جنونی اور سرمایہ داری کی اطاعت کرنے والے شہری تیار کیے جا سکیں۔ جو حکمرانوں کی قومی اور مذہبی جنگوں میں کام آ سکیں۔

کوئی بھی سیاسی پارٹی ان اہم مسائل کی نشاندہی نہیں کر رہی اور نہ ہی ان کے پاس کوئی حل ہے۔ اس نظام میں اصلاحات کی کوششیں مزید بگاڑ پیدا کرتی ہیں۔ چینی حکمرانوں کی کاسہ لیسی میں سکولوں میں چینی زبان کو رائج کرنے کا فرمان جاری کر دیا گیا ہے جبکہ اردو یا سندھی پڑھانے کے لیے انفراسٹرکچر موجود نہیں۔ میٹرک اور انٹر کے امتحانی نظام، جس کے خلاف مظاہرے تقریباً اب ہر سال ہوتے ہیں، میں بڑے پیمانے پر بے قاعدگیاں موجود ہوتی ہیں۔ اس میں پیسے

بچانے کے لیے غیر معیاری قابلیت کے حامل افراد سے پرچوں کو چیک کروایا جاتا ہے جس کی وجہ سے ہر سال لاکھوں بچوں کا مستقبل داؤ پر لگ جاتا ہے۔ طلبہ کا اس امتحانی نظام سے ہی اعتماد اٹھتا چلا جا رہا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس نظام میں نمبر لینے کے لیے پڑھنے کی نہیں بلکہ پیسے کی ضرورت ہے۔ ایک جگہ پر اساتذہ کی حاضری کو یقینی بنانے کے لیے ڈیجیٹل حاضری کو متعارف کرایا گیا ہے اور اس سے تعلیمی نظام کی اصلاح کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔ جبکہ ان مشینوں کی خریداری میں بڑے گھپلے موجود ہیں۔ اور تعلیمی نظام میں نہ کوئی بہتری آئی ہے نہ اس نظام میں رہتے ہوئے آ سکتی ہے۔

آنے والے عرصے میں تعلیم کی بنیادی سہولت پر مزید حملے کیے جائیں گے اور ملک میں ناخواندگی اور غیر معیاری تعلیم میں اضافہ ہوگا۔ سکولوں سے لے کر یونیورسٹیوں تک فیسوں میں اضافہ کیا جائے گا جبکہ دوسری جانب اساتذہ کی تنخواہوں میں کمی آئے گی۔ ایسے میں یہاں تمام لوگوں کے لیے تعلیم کا بنیادی حق اور معیاری سائنسی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایک سوشلسٹ انقلاب برپا کرنے کی ضرورت ہے۔

6۔ سیاست، کس عہد کی؟

پاکستان کی سیاست میں بہت بڑی تبدیلیاں آ چکی ہیں۔ بظاہر دیکھنے میں ایسا کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا اور رائج الوقت سیاسی پارٹیوں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ گزشتہ کئی دہائیوں سے جاری سیاست کا تسلسل آج بھی جاری ہے۔ لیکن اگر سطح سے نیچے چلنے والے عمل کا جائزہ لیں تو اس تبدیلی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اس میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ کیا اس وقت موجود سیاسی جماعتوں کی عوام میں وہی حمایت ہے جو آج سے ایک دہائی قبل یا پھر صرف پانچ سال قبل موجود تھی۔ اس کا جواب تلاش کرنے کے لیے کسی ایسے پیمانے کی ضرورت پیش آئے گی جس سے ان پارٹیوں کی حمایت کو جانچا جا سکے۔ پاکستانی ریاست کی تنزلی اور زوال کے باعث کوئی بھی ادارہ ایسا نہیں کہ وہ ایسا کوئی پیمانہ فراہم کر سکے۔ کسی بھی پارٹی کی مقبولیت کو جاننے کے لیے سب سے بڑا پیمانہ انتخابات ہوتے ہیں۔ لیکن پاکستان میں جہاں سرمایہ داری کسی انقلاب کے ذریعے نہیں بلکہ سامراجی بوٹوں کے ذریعے آئی وہاں سرمایہ دارانہ جمہوریت کے ادارے بھی صحت مند حالت میں تعمیر نہیں ہو سکے۔ اپنے بدترین زوال کے عہد میں یہ ریاست کسی بھی صورت شفاف انتخابات کروانے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ 2013ء کے انتخابات میں اتنے بڑے پیمانے پر دھاندلی ہوئی کہ اس دھاندلی سے مختلف صوبوں میں فیض یاب ہونے والی پارٹیوں نے بھی دھاندلی کا شور مچایا۔ اگر پاکستان کے انتخابی میکانزم کو دیکھا جائے تو واضح ہے کہ اس میں پاکستان کے تمام ووٹروں کا اندراج بھی نہیں کیا جا سکتا ان کی رائے لینا تو بہت دور کی بات ہے۔ جس ملک میں دو دہائیوں سے مردم شماری بھی نہ ہوئی ہو وہاں شفاف انتخابات کیسے ہو سکتے ہیں۔ اس حوالے سے عام انتخابات ہوں یا ضمنی انتخابات ان کے نتائج جی ایچ کیو یا سامراجی طاقتوں کی مرضی سے طے ہوتے ہیں۔ گویا کہ کسی سیاسی پارٹی کی عوام میں مقبولیت جانچنے کا یہ اوزار انتہائی ناکارہ حالت میں ہے۔

بہت سے ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک میں عوامی رائے کو جانچنے کے لیے ایسے ادارے بنے

ہیں جو مختلف سرویز کے ذریعے سماج کی مختلف پرتوں سے سیمپل اکٹھے کر کے ایک عمومی خاکہ بناتے ہیں۔ گو کہ ان سرویز کے نتائج کو بھی مختلف ملٹی نیشنل کمپنیوں یا سیاسی پارٹیوں کے مفادات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور سرمایہ داری کے زوال کے ساتھ ان میں بدعنوانی بڑھتی جا رہی ہے لیکن کسی نہ کسی شکل میں ایک خاکہ سامنے آ جاتا ہے۔ پاکستان میں اس کی بھی کوئی گنجائش موجود نہیں اور جو سرویز ہوتے ہیں وہ جھوٹ کے پلندے کے سوا کچھ نہیں۔

اس کے بعد جو رستہ رہ جاتا ہے وہ سیاسی پارٹیوں کے جلسے، جلوس اور ریلیوں میں عوام کی شمولیت کو دیکھ کر اندازہ لگانے کا ہے۔ اس وقت رائج الوقت تقریباً تمام سیاسی پارٹیاں کسی نہ کسی شکل میں اقتدار میں موجود ہیں۔ اور اپنے اسی اقتدار کی وساطت سے لوگوں کی ایک مخصوص تعداد کو مجبور کیا جا سکتا ہے کہ اگر وہ روزمرہ کے کسی مسئلے کو حل کروانا چاہتے ہیں تو ان کے جلسے میں حاضری لگائیں۔ اسی طرح سرکاری ملازمین کو جلسوں کی تعداد بڑھانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پچھلے عرصے میں ایک رجحان بڑے پیمانے پر پروان چڑھا ہے وہ پیسے دے کر لوگوں سے شرکت کروانے کا ہے۔ ایک طرف تو یہ مروجہ سیاست اور سیاسی پارٹیوں کے دیوالیہ پن کی عکاسی کرتا ہے اور دوسری طرف وہ محنت کش عوام کی اس سیاست سے بیگانگی کا اظہار ہے۔ ان محنت کشوں کو یہ بالکل بھی پرواہ نہیں کہ وہ کسی سیاسی پارٹی کے جلسے میں حاضری کی فیس وصول کر رہے ہیں یا کھانا کھا رہے ہیں انہیں اپنے پیٹ کی آگ بجھانے سے غرض ہے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ایسے ادوار کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ 1960ء، 70ء اور 80ء کی دہائی میں جب محنت کشوں کی سیاست عروج پر تھی اور دائیں اور بائیں بازو کی واضح تفریق موجود تھی اس وقت محنت کش کبھی بھی ایسا کرنے کے بارے میں نہیں سوچ سکتے تھے۔ اس وقت سیاست کا انداز بھی نرالا تھا اور لوگ اپنے شوق اور جستجو سے سیاست میں حصہ لیتے تھے۔ خود اپنی پارٹیوں کے جھنڈے لگاتے تھے، دفتر بناتے تھے اور دیگر سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے۔ لیکن آج پارٹی کے فلیکس اور جھنڈے بھی پیسے دے کر لگوائے جاتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ نظریاتی سیاست کا خاتمہ ہے۔

اس حوالے سے گزشتہ عرصے میں ہمیں کوئی بھی پارٹی ایسا جلسہ کرتے ہوئے نظر نہیں آتی جس میں اقتدار کی بیساکھی استعمال کیے بغیر یا پیسوں کے لالچ کے بغیر عوام کا ایک بہت بڑا جم غفیر اکٹھا کیا ہو۔ عوام کی ایک بہت بڑی تعداد صرف اپنے لیڈر کی تقریر سننے کے لیے اور اس کے معاشی سماجی پروگرام کو سننے کے لیے جمع ہوئی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام سیاسی پارٹیوں کا ایک ہی ایجنڈا

ہے جو کہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی پالیسیوں پر عملدرآمد ہے اور سب اقتدار میں حصہ لے کر لوٹ مار کرنا چاہتی ہیں۔ ایک دوسرے سے فرق صرف اتنا بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بڑا چور ہے اور ہم چھوٹے چور۔ اس کے علاوہ تمام سیاسی پارٹیوں میں فرق کرنا مشکل ہے۔ مختلف ممبران پارلیمنٹ یا سیاسی لیڈروں کو دیکھ کر فوراً بتانا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ آج کل کون سی سیاسی پارٹی میں ہیں۔ اسی طرح کون سی سیاسی پارٹی آج کل کس کے ساتھ ہے اور کس کے خلاف اس کے لیے تازہ ترین خبروں سے باخبر رہنا ضروری ہے ورنہ غلطی ہو سکتی ہے۔ بالخصوص پچھلے عرصے میں وفاداریاں اتنی تیزی سے تبدیل ہوئی ہیں اور پارٹیوں کے ایک دوسرے سے فروعی جھگڑے اور دوستیاں اتنی تیز رفتاری سے ہوئیں کہ اگر چند ہفتے خبریں نہ سنیں تو بتانا مشکل ہے کہ کون کس کے ساتھ ہے۔

اس کی بنیادی وجہ نظریاتی سیاست کا فقدان اور سیاست کی عمومی زوال پذیری اور گراوٹ ہے۔ اسی باعث پورے اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ سیاست تبدیل ہو چکی ہے۔ اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ انقلابی سیاست کا آغاز ہو چکا ہے اور عنقریب ایک انقلابی پارٹی سیاسی افق پر چھا جائے گی۔ ذہن پر زور دینے کی تکلیف نہ کرنے والے فارمولا پرست ہی ایسا نتیجہ اخذ کریں گے۔ لیکن جب ہم سیاست کی تبدیلی کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو پارٹیاں اس وقت افق پر موجود ہیں ان کی سماجی بنیادیں ختم ہو چکی ہیں اور ان بنیادوں سے کٹ کر وہ ہوا میں معلق ہیں۔ سیاست میں کوئی بڑا جھٹکا ان کی ہیئت کو بھی تبدیل کر دے گا۔

اس کی واضح مثال پیپلز پارٹی کی ہے۔ ایک وقت تھا جب پاکستان میں پیپلز پارٹی نہیں تھی۔ بائیں جانب کمیونسٹ پارٹیاں یا نیپ (NAP) تھی جبکہ دائیں جانب مسلم لیگ اور مذہبی جماعتیں تھیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ 1960ء کی دہائی میں جہاں پوری دنیا میں تحریکیں برپا ہو رہی تھیں وہاں پاکستان میں بھی طلبہ، مزدوروں اور کسانوں کی تحریکیں ابھرنا شروع ہوئیں۔ پورے سماج میں نئی سیاست کے بیج موجود تھے لیکن کوئی بھی سیاسی پارٹی ان کی آبیاری نہیں کر رہی تھی۔ اسی سماج میں یہ بیج مختلف ہڑتالوں اور تحریکوں کی شکل میں کونپلیں بن کر ابھرنے لگے۔ طلبہ کی ایوب آمریت کے خلاف مختلف تحریکیں ساٹھ کی دہائی میں چلتی رہیں جن کی پاداش میں کبھی طلبہ کو کراچی بدر کیا گیا اور کبھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند کیا گیا۔ کراچی سے چٹاگانگ تک طلبہ نے مختلف تحریکوں کے ذریعے اپنے حقوق حاصل کیے۔ اس دوران مزدوروں کی انجمنیں بھی ابتدائی مراحل سے نکل کر مضبوط ہونے کی جانب بڑھیں جن میں فروری 1967ء کی ریلوے کی ہڑتال

انتہائی اہم ہے۔اس ہڑتال میں ریلوے کی مروجہ ٹریڈ یونین قیادت کی نافرمانی کرتے ہوئے محنت کشوں نے اس ملک کی سب سے کامیاب ہڑتال کرنیوالوں میں اپنا نام لکھوایا۔روہڑی میں جب اس ہڑتال کوتوڑنے کی کوشش کی گئی تو مزدوروں نے انجن کے آگے لیٹ کراس ہڑتال کوکامیاب کیا۔لیکن اس دوران کوئی بھی سیاسی پارٹی ان تحریکوں کی قیادت فراہم نہیں کررہی تھی۔کمیونسٹ پارٹیاں ایوب آمریت اور ترقی پسند بورژوازی کے ہاتھ مضبوط کررہی تھیں۔ایسے میں معاشی محاذوں پر چلنے والی ان بکھری ہوئی تحریکوں نے ایک نئی بننے والی پارٹی کواپنے سیاسی اظہار کا ذریعہ بنایا۔اس پارٹی کی خاص بات یہ تھی کہ اس نے سوشلزم کا نعرہ لگایا تھا اور سرمایہ داری کے مکمل خاتمے کی بات کی تھی جو کسی اور نے نہیں کی تھی۔ بہت سے قنوطی دانشور آج بھی 69-1968ء کے واقعات کوانقلاب تسلیم نہیں کرتے اوراسے جمہوریت کے لیے ایک تحریک قرار دیتے ہیں۔لیکن سائنسی بنیادوں پر دیکھا جائے تو اس وقت محنت کشوں نے ملکیت کے رشتوں کوچیلنج کیا تھا اور سرمایہ دارانہ نظام کوللکارا تھا۔ایک بالشویک پارٹی نہ ہونے کے باعث اس انقلاب کواس کی حتمی منزل تک نہیں پہنچایا جا سکا۔ایوب آمریت کے خاتمے اور پیپلز پارٹی کے برسر اقتدار آنے پر تو الگ سے تفصیلی بحث کی جاسکتی ہے لیکن اس وقت زیادہ اہم اس سماجی کیفیت کا گہرائی میں جائزہ لینے کی ضرورت ہے جس میں پیپلز پارٹی ابھر کر سامنے آئی۔ بورژوا تجزیہ نگار اور دانشور فرد کے کردار کو ہر شے پر حاوی کر دیتے ہیں اوران کے مطابق تاریخ انہی ''عظیم'' افراد کی مرہون منت ہے۔لیکن مارکسی جہاں فرد کے کردار کونظر انداز نہیں کرتے وہاں ان مخصوص سماجی عوامل کا بھی سائنسی طریقے سے مشاہدہ کرتے ہیں جنہوں نے ان تحریکوں یا تاریخی کرداروں کوجنم دیا۔ایوب آمریت کے دور میں ہمیں واضح نظر آتا ہے کہ سماج میں نہ صرف بے چینی موجود تھی بلکہ اس کا اظہار مختلف شکلوں میں ہورہا تھا۔ بہت سی سیاسی پارٹیاں بھی موجود تھیں جن میں کچھ اپوزیشن کا کردار بھی ادا کر رہی تھیں۔لیکن ان میں سے کوئی بھی سماج میں جاری ہونے والی اس بنیادی تبدیلی سے ہم آہنگ نہیں ہوسکی اوران مخصوص کیفیات کونئی سیاسی پارٹی کی ضرورت پیش آئی۔

اسی قسم کی کیفیت ہمیں ضیا آمریت کے بعد کے دور میں نظر آتی ہے جب نواز شریف، ایم کیو ایم اور دیگر بہت سی دائیں بازو کی جماعتوں کا ابھار ہوا۔اس وقت ایک انقلاب کی پسپائی کے بعد طبقاتی کشمکش پس منظر میں چلی گئی تھی اور سماج پر قومی، لسانی اور فرقہ وارانہ تعصّبات غالب آ چکے تھے۔ریاست ہمیشہ سے ہی محنت کشوں کی طبقاتی جڑت کوتوڑنے کے لیے انہیں مختلف تعصّبات

میں دھکیلنے کی کوشش کرتی ہے لیکن اس مخصوص عرصے میں ریاست کی کاوشوں کو سماج میں وہ زرخیز حالات دستیاب ملے جس کی انہیں ضرورت تھی۔ کراچی، جو پرولتاریہ کا سب سے بڑا شہر تھا اور جہاں 70ء کی دہائی میں محنت کشوں نے بہت سی صنعتوں پر قبضہ کر کے اپنے جمہوری کنٹرول میں بھی لے لیا تھا، میں انقلابی تحریک کی پسپائی اور قیادت کی غداری کے باعث ایک عمومی مایوسی کی کیفیت تھی۔ ایسے میں وہاں ایم کیو ایم کو پنپنے کے لیے سازگار حالات میسر آئے۔ پنجاب میں جہاں کسانوں اور مزدوروں کی بہت بڑی بغاوتیں ہوئی تھیں اور لاہور جسے پیپلز پارٹی کا گڑھ کہا جاتا تھا وہاں محنت کش طبقہ بتدریج سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرتا گیا اور درمیانے طبقے کے رجعتی نظریات حاوی ہوتے گئے۔ اسی درمیانے طبقے کو اپنے ردانقلابی نظریات کا مجسم اظہار نواز شریف کی شکل میں نظر آیا جو ریاستی آشیر باد سے پروان چڑھتا رہا۔ یہ سب کچھ یقیناً سیدھی لکیر میں نہیں ہوا بلکہ اس دوران ہمیں ایم آر ڈی کی تحریک کی شکل میں بہت بڑی مزاحمتیں بھی دیکھنے کو ملیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ مزاحمت زوال پذیر ہوتی رہی اور قیادت کی غداریوں اور سوویت یونین کے انہدام کے بعد اس زوال میں معیاری جستیں لگیں۔ طلبہ تحریک جو انقلابی نظریات کی آماجگاہ تھی وہاں غنڈہ گردی اور بھتہ خوری کا رواج نظر آیا۔ مزدور تحریک جو نظریاتی سیاست کا مرکز تھی وہاں غداریاں اور سودے بازیاں نظر آئیں۔ اس دور کی سیاست کو اس عہد کے مخصوص کردار سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

اسی طرح یہ بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کہ سیاسی پارٹیاں ہوا میں نہیں بنتیں بلکہ مخصوص سماجی معاشی حالات ہوتے ہیں جو کسی سیاسی پارٹی کو سماج کے ایک مخصوص حصے کا نمائندہ بناتے ہیں۔ مشرف دور میں ہمیں ایک دفعہ پھر وکلا اور نام نہاد سول سوسائٹی کی دائیں بازو کی تحریکوں کا ابھار نظر آتا ہے جس نے تحریک انصاف کو وہ خام مال مہیا کیا جس پر سوار ہو کر اس نے چار دن کی چاندنی دیکھ لی۔ ریاست کی تمام تر کوششوں کے باوجود تحریک انصاف اس مخصوص کردار سے باہر نہیں نکل سکی اور کراچی، بلوچستان یا دیگر جگہوں پر اپنے ساتھ عوام کی ان پرتوں کو نہیں جوڑ سکی جنہیں وہ ابتدا میں متوجہ نہیں کر سکی تھی۔ بظاہر ایسا ہی ہے کہ لیڈر عوام کی قیادت کرتے ہیں اور انہیں رستہ دیتے ہیں لیکن دوسری جانب سماج کا جو حصہ اس سیاسی پارٹی کو اپنے اظہار کا وسیلہ بناتا ہے وہ بھی اس کی سمت کا تعین کرتا ہے۔ لیڈر درحقیقت اپنے ساتھ جڑے لوگوں کی خواہشات میں مقید ہوتا ہے اور اپنی اس حمایت کو برقرار رکھنے کے لیے اسے ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے چلنا پڑتا ہے۔ اگر وہ

ان لوگوں کی خواہشات اور امنگوں کے برعکس کسی رستے پر چلتا ہے یا ان سے ہم آہنگ نہیں رہتا تو وہ حمایت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سماج کی اس پرت کی عمومی کیفیت میں اگر کوئی معیاری تبدیلی وقوع پذیر ہو رہی ہے اور پارٹی قیادت اس کے مطابق اپنے آپ کو تبدیل نہیں کرتی تو بھی وہ پارٹی قائم نہیں رہ سکتی۔

اس وقت تقریباً تمام سیاسی پارٹیوں کی یہی کیفیت ہے جو سماج میں جاری اس تبدیلی کے عمل کے ساتھ ہم آہنگ نہیں اور پرانے ہتھکنڈوں سے عوامی حمایت کو جوڑے رکھنے کی تگ و دو میں ہیں۔ اس وقت کوئی بھی پارٹی مزاحمت کا رستہ اختیار نہیں کرنا چاہتی اور کسی نہ کسی صورت میں ریاست کے کسی دھڑے کی آشیر باد یا اقتدار کے ساتھ چمٹے رہ کر اپنا اثر و رسوخ قائم رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن اس سے وہ سماج کے کسی بھی حصے کی نمائندگی نہیں کر رہے بلکہ ریاست کے مختلف دھڑوں کے نمائندے بن کر رہ گئے ہیں۔ مڈل کلاس کی نمائندگی بھی کسی حد تک تحریکِ انصاف یا مذہبی پارٹیوں میں نظر آتی ہے مگر پھر اتنی ہی تیزی سے پسپا بھی ہو جاتی ہے۔ یہ سلسلہ زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکتا اور سماج میں موجود مختلف طبقات کا ٹکراؤ اپنا سیاسی اظہار کرنے کی طرف جائے گا اور ایسے افراد اور پارٹیوں کو ہی منظر عام پر لائے گا جو ان کی موجودہ کیفیت کی ترجمانی کرتے ہوں۔

پیپلز پارٹی

ایک لمبے عرصے سے پاکستان کے محنت کش طبقے نے اس پارٹی کو اپنے سیاسی اظہار کا ذریعہ بنائے رکھا اور یہ اس طبقے کی روایت بن گئی تھی۔ لیکن قیادت کی مسلسل غداریوں کے بعد طبقے کا اس پارٹی پر اعتماد ختم ہو چکا ہے۔ موجودہ قیادت مرکز میں پانچ سال جبکہ سندھ میں نو سال برسر اقتدار رہ چکی ہے۔ اس دوران تاریخ کے سب سے بدترین مزدور دشمن اقدامات کیے گئے اور محنت کش طبقے پر نجکاری، بیروزگاری اور مہنگائی سمیت بدترین حملے کیے گئے۔ بدترین لوڈ شیڈنگ ہو یا تھر میں بھوک سے ہونے والی ہلاکتیں، پیپلز پارٹی کی موجودہ قیادت نے محنت کشوں کو غربت اور محرومی کی گہری کھائی میں دھکیلنے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ فوجی جرنیلوں سے لے کر امریکی سامراج کی بدترین گماشتگی کے ساتھ ساتھ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی پالیسیوں کو پوری شدت سے لاگو کیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ بدعنوانی اور لوٹ مار کی بھی نئی تاریخ رقم کی۔ یہی وجہ ہے کہ آج محنت کش طبقے کا کوئی بھی حصہ اس پارٹی پر اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں۔ زرداری کے بعد بلاول کے

ذریعے عوام کو ایک دفعہ پھر متوجہ کرنے کی کوشش بری طرح ناکام ہوئی ہے۔ 18 اکتوبر کی حالیہ ریلی اس بدترین ناکامی کا اظہار ہے جس میں تمام تر ریاستی آشیر باد اور محنت کشوں کی ہڈیاں نچوڑ کر لوٹے ہوئے پیسے کو استعمال کرنے کے باوجود بڑا شو نہیں کیا جا سکا۔ اس ریلی سے پہلے بلاول کی فضل الرحمان سے بغل گیری بھی علامتی طور پر اہم تھی۔ اس دوران نواز شریف اور الطاف حسین کو بھی انکل کہہ کر پکارا گیا۔ اس سے واضح ہو گیا کہ پیپلز پارٹی کی موجودہ قیادت اور اس کے گرد جمع ہونے والے پالتو وفاداروں کا گروہ کس کے اشاروں پر چل رہا ہے۔ جس قیادت نے اربوں ڈالر کی لوٹ مار کی ہو اس سے کسی قسم کی مزاحمت کی توقع کرنا ہی بیوقوفی ہے۔ چوروں نے بھی کبھی کوئی مزاحمت کی ہے۔ بلکہ چور تو آواز اونچی کرنے کی جرات بھی نہیں کر سکتا، مزاحمت تو دور کی بات ہے۔ ان چوروں کی تمام تر سیاست کا محور اپنی لوٹی ہوئی دولت کا تحفظ ہے اور اپنی ان جائیدادوں اور مراعات کے تحفظ کے لیے وہ عوام کو استعمال کرتے ہیں۔ کسی بھی بڑی ریلی اور جلسے کا حتمی مقصد یہی ہوتا ہے کہ ریاست کے مختلف دھڑوں کی کشمکش میں اپنی طاقت کا اظہار کر کے پلڑا بھاری کیا جائے اور اس کے مطابق اپنا حصہ طلب کیا جائے۔ جس طرح کتے ہڈی پر لڑتے ہیں اسی طرح یہ سیاسی قیادتیں عوام کی محنت سے پیدا کی گئی دولت پر لڑتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے پاس میڈیا کے دلالوں سے لے کر ریاستی اداروں کی پشت پناہی ہوتی ہے۔

یہاں یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا پیپلز پارٹی اس ملک میں دوبارہ محنت کشوں کی روایت بن سکتی ہے۔ اس کا جواب نفی میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ پارٹی ایک تعفن زدہ لاش بن چکی ہے جس سے پورا سماج بدبو محسوس کر رہا ہے۔ بہت سے لوگ اس کا موازنہ مضحکہ خیز انداز میں برطانیہ کی لیبر پارٹی سے کرتے ہیں۔ اس ملک میں جسے جمہوریت کی ماں قرار دیا جاتا ہے وہاں سرمائے کی آمریت کے باوجود جمہوری ادارے کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں اور سیاسی پارٹیوں میں انتخابات کی گنجائش بھی موجود ہے۔ پاکستان میں یہ ادارے آغاز سے ہی نہیں پنپ سکے اور پارٹیوں میں انتخابات اور قیادت کو منتخب کرنے کا کوئی رواج نہیں۔ اسی لیے موروثی سیاست نظر آتی ہے۔ بہت سے ذی شعور حیران ہوتے ہیں کہ کئی دہائیوں سے اس پارٹی میں اہم عہدوں پر موجود لوگ کیسے ایک لیڈر کی سیاست سے نابلد اولاد کو لیڈر تسلیم کر لیتے ہیں اور اس کی تابعداری کا دم بھرنے لگتے ہیں۔ درحقیقت پارٹیوں میں موجود یہ لوگ اسٹیٹس کو کے خواہشمند ہوتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح پارٹی میں اپنی پوزیشن سے چمٹے رہنا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ اس طرز عمل کو اپناتے ہیں اور عوام پر

بھی مسلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے اس نئے لیڈر کی بیوقوفیوں اور مسخرے پن کو انتہائی سنجیدگی اور متانت سے دلیری اور جرات کا نام دیا جاتا ہے اور عوام کو باور کروانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ مسخریاں ان کے روشن مستقبل کی ضمانت ہیں۔

لیکن دوسری جانب پسماندگی کے باعث اس سماج میں افراد کا کردار مبالغہ آرائی کا بھی حامل ہو جاتا ہے اور اس حوالے سے لوگوں کی وابستگی بظاہر پارٹی کے پروگرام کے ساتھ نہیں بلکہ فرد کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس لیے موروثی سیاست کو سماج میں مادی بنیادیں ملتی ہیں جس کے باعث وقت کے ساتھ ساتھ یہ عمل مستقل حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ بورژوا تجزیہ نگار چونکہ سماج میں جاری متضاد جدلیاتی عمل کو جاننے سے قاصر ہوتے ہیں اس لیے صرف ظاہریت کو ہی ازلی اور ابدی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ ایسے میں فرد کا کردار حتمی حیثیت حاصل کر جاتا ہے۔ بورژوا دانش اس حد تک زوال پذیر ہو چکی ہے کہ سیاسی لیڈروں کے لباس سے لے کر جوتوں تک کو موضوع بحث بنا کر سیاسی نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ گو کہ ان تفصیلات کی اپنی اہمیت ہے اور کسی بھی لیڈر کی شخصیت کو جاننا سیاست میں اہم ہے لیکن اسی کو مرکزی نکتہ بنا لینا بیہودگی ہے۔ لیڈر کی شخصیت کو کُل سے کاٹ کر دیکھا جائے تو وہ انتہائی سطحی تجزیہ بن کر رہ جائے گا۔

ایسے میں بلاول کا موازنہ بینظیر سے کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ اسی طرح پارٹی کو دوبارہ ابھارے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی عہد کے کردار کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ بینظیر نے جب پارٹی کی قیادت سنبھالی تو اس وقت پارٹی شدید ترین جبر کا شکار تھی اور کارکنوں کو کوڑوں اور پھانسیوں کا سامنا تھا۔ جبکہ بلاول نے اس وقت قیادت سنبھالی ہے جب پارٹی اقتدار کے مزے لوٹ رہی ہے۔ ایسے میں تقریر کے دوران کرپشن اور غربت کی باتیں کرنا مضحکہ اور اپنی جگ ہنسائی کے سوا کچھ نہیں۔ سندھ میں غربت اور بیروزگاری کا ایک سمندر موجود ہے، علاج اور تعلیم جیسی بنیادی سہولیات نجکاری کے ذریعے مزید برباد کی جا رہی ہیں، مزدوروں اور کسانوں کی اکثریت تاریخ کی سب سے زیادہ ناقابلِ برداشت سماجی کسمپرسی میں مبتلا ہیں جبکہ ایسے میں بھی پرتعیش زندگی کے مزے لوٹنے والے جاگیرداروں میں سے شاید ہی کوئی باقی بچا ہو جو پیپلز پارٹی میں شامل نہ ہوا ہو اور لیڈر غربت کے خاتمے کی بات کرے تو اسے کیا کہا جائے۔

ایسے میں عہد کے کردار کو اور سماج کی عمومی کیفیت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس وقت بہت سی تحریکیں چل رہی ہیں جن میں درجنوں اداروں میں چلنے والی نجکاری کیخلاف تحریکوں سے لے کر

کسانوں، ینگ ڈاکٹروں اور اساتذہ کی تحریکیں ہیں۔ اس کے علاوہ نجی صنعتی اداروں میں بھی تحریکیں موجود ہیں جبکہ طلبہ تحریک ابھرنے کے لیے بیتاب ہے۔ ایسے میں کسی تحریک نے پیپلز پارٹی کا رخ نہیں کیا۔ 2011ء میں چلنے والی کے ای ایس سی کی تحریک ہو یا اس سال فروری میں پی آئی اے کی تحریک پیپلز پارٹی کے مقامی لیڈروں کی موجودگی کے باوجود کسی نے بھی ان پر اعتماد نہیں کیا اور ان کو چیر کر آگے بڑھیں۔ پی آئی اے کے کارکنوں پر تشدد اور گولی چلانے میں سندھ میں پیپلز پارٹی کی حکومت بھی اتنی ہی ملوث ہے جتنی ن لیگ کی مرکزی حکومت اور رینجرز ملوث ہیں۔ دوسری جانب پیپلز پارٹی کی قیادت کے کسی بھی حصے کو ان تحریکوں سے کوئی دلچسپی نہیں اور ان کے لیے سب سے اہم یہ ہے کہ مختلف علاقوں کے بااثر رسہ گیر جاگیرداروں، ظالم سرمایہ داروں اور کرپٹ ریاستی اہلکاروں کی حمایت کیسے حاصل کر سکتے ہیں اور ان کے ذریعے اسمبلی میں پہنچ کر اپنی لوٹ مار کو جاری رکھ سکتے ہیں۔ ایسے میں محنت کش طبقے سے یہ توقع کرنا کہ وہ تحریک کی شکل میں دوبارہ اسی در پر ماتھا ٹیکے گا، صرف دیوانے کا خواب ہوسکتا ہے۔ محنت کش طبقے اور طلبہ کی موجودہ کیفیت مکمل طور پر تبدیل ہو چکی ہے۔ ملک میں ایک نئی نسل پروان چڑھ چکی ہے جس نے پیپلز پارٹی کا یہی غدارانہ روپ دیکھا ہے۔ اس روپ میں اگر محنت کشوں کو دھوکہ دینے کے لیے ان کی منافقانہ حمایت بھی کی جائے گی تو بھی انہیں متوجہ نہیں کیا جا سکتا۔ درحقیقت پیپلز پارٹی ایک ایسے نکتے پر پہنچ چکی ہے جہاں اس کا مستقبل تاریخ کا کوڑا دان ہے۔ اس ملک میں ابھرنے والی عوامی تحریک اسے اس کے حقیقی مقام تک ضرور پہنچائے گی۔

ایم کیو ایم

ریاستی آشیر باد سے قائم ہونے والی یہ نیو فاشسٹ پارٹی اس وقت اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہے۔ ریاست نے پہلے بھی اس پارٹی کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن سماج میں ایسے عوامل موجود تھے جن کے باعث یہ پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ ابھری اور مزید دو دہائیوں تک کراچی کے محنت کشوں پر مظالم ڈھاتی رہی۔ کبھی بھی ریاستی جبر، گرفتاریوں اور دفاتر کی تالہ بندی سے سیاسی پارٹیوں کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ایم کیو ایم کے علاوہ اس کی مثال پیپلز پارٹی بھی ہے۔ جس کے منتخب وزیر اعظم کو پھانسی دے دی گئی، کارکنوں پر کوڑے برسائے گئے، پھانسیاں دی گئیں، جھنڈوں تک پر پابندی لگا دی گئی لیکن اس کے باوجود اس پارٹی کو ختم نہیں کیا جا سکا۔ آج اگر یہ پارٹی ختم ہو رہی

ہے تو قیادت کی غداریوں کے باعث ہو رہی ہے۔ یہی کیفیت ایم کیو ایم کی ہے۔ ریاست نے اس پالتو تنظیم کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کے لیے اسے پہلے بھی کئی دفعہ تقسیم کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ لیکن اب جہاں ریاست کے مختلف دھڑے اور سامراجی قوتیں اس کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کر رہی ہیں اور اس کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہ رہی ہیں وہاں اس پارٹی کی کراچی کے درمیانے طبقے میں موجود بنیادیں بھی ہل چکی ہیں۔ اگر اس پارٹی کی ماضی جیسی حمایت موجود ہوتی تو تمام تر ریاستی جبر کے باوجود اس کا کچھ نہیں بگاڑا جا سکتا تھا۔ یہاں تک کہ اگر لیڈر کو صفحہ ہستی سے غائب بھی کر دیا جائے تو کوئی دوسرا شخص وہ کردار نبھانے کے لیے سامنے آ جاتا ہے۔ لیکن آج واضح طور پر نظر آ رہا ہے کہ ایک لمبا عرصہ اقتدار میں رہنے کے باعث اس پارٹی کی حمایت کرنے والے درمیانے طبقے کی بڑی تعداد اس کی حمایت سے دستبردار ہو چکی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ریاست کی ہی تخلیق کردہ پاک سرزمین پارٹی میں شامل ہو چکی ہے۔ درحقیقت باقی ملک کی طرح یہاں بھی کسی بھی پارٹی کے پاس یہ حمایت موجود نہیں۔ یہ حمایت حاصل کرنے کے لیے ایک مخصوص پروگرام درکار ہے جو کوئی بھی پارٹی دینے سے قاصر ہے۔ تحریک انصاف ہو یا پاک سرزمین پارٹی، وہ مہاجر قومیت کے مسئلے کو اجاگر کر کے ہی اپنی سیاسی حمایت بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں اور وہی فارمولا دہرانے کی کوشش کرتے ہیں جس کے باعث ماضی میں ایم کیو ایم نے حمایت حاصل کی تھی۔ لیکن آج اس پارٹی کی حمایت ختم ہونے کی وجہ ہی یہی ہے کہ اس فارمولے کی مدت پوری ہو چکی ہے اور انہی لوگوں اور خاص کر نئی نسل کو متوجہ کرنے کے لیے ایسے پروگرام کی ضرورت ہے جو ان کے مسائل کا حل دے سکے۔ ایسے میں ایم کیو ایم لندن اور پاکستان کی تقسیم خواہ جعلی ہے یا اصلی، یہ دونوں طریقوں سے پارٹی کی کمزور ہوتی ہوئی ساکھ کی عکاسی کرتی ہے جبکہ پاک سرزمین پارٹی ہو یا ایم کیو ایم (حقیقی) کوئی بھی وسیع حمایت حاصل نہیں کر پایا اور ریاست کے مختلف دھڑوں کی لڑائی میں پراکسی کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ تمام گروپ کسی نہ کسی شکل میں ریاستی آشیر باد سے اپنی لوٹ مار جاری رکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے مختلف ناٹک کھیلتے رہتے ہیں۔ آنے والے عرصے میں جہاں ریاست کی ٹوٹ پھوٹ میں مزید شدت آئے گی وہاں ان گروپوں کے بھی مزید ذیلی گروپ وجود میں آئیں گے اور بڑے سے بڑا حصہ وصول کرنے کے لیے ہر قسم کی قتل و غارت کریں گے۔

اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے سماج کو مہاجر، سندھی، پشتون بنیادوں پر دیکھنے کی بجائے طبقاتی

بنیادوں پر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ جہاں سماج میں قومی ولسانی بنیادوں پر تقسیمیں موجود ہیں وہاں سب سے بڑی تقسیم امیر اور غریب کی ہے۔اس تقسیم کے بارے میں بات کرنا بھی آج کی سیاست میں گناہ کبیرہ قرار دے دیا گیا ہے۔کوئی بھی صحافی یہ سوال نہیں اٹھا سکتا، کوئی سیاست دان یا تجزیہ نگار اس تقسیم پر بات نہیں کرسکتا۔لیکن تمام تر کوششوں کے باوجود اس تقسیم کو دبایا نہیں جا سکتا اور یہ سب سے فیصلہ کن انداز میں سیاست پر اثر انداز ہوتی ہے۔کراچی میں امیر مہاجر بھی ہیں اور غریب مہاجر بھی، امیر پشتون بھی ہیں اور غریب پشتون بھی، امیر سندھی اور بلوچی بھی اور غریب سندھی اور بلوچی بھی۔اس لیے کراچی میں امیر اور غریب کی سیاست کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔محنت اور سرمائے کے تضاد کا حل دینے کی ضرورت ہے۔صرف انہی بنیادوں پر ہی کراچی میں وسیع حمایت حاصل کی جاسکتی ہے۔ماضی میں جن دائیں بازو کی پارٹیوں کو بھی وسیع بنیادیں ملی انہوں نے بھی کسی حد تک طبقاتی مسئلے کو اپنے دائیں بازو کے نظریات کی بنیاد بنانے کے لیے استعمال کیا۔آج پھر سماج ایسی ہی کیفیت میں ہے۔آنے والے دنوں میں دائیں اور بائیں دونوں جانب نئی سیاسی تحریکیں ابھرنے کے واضح امکانات موجود ہیں۔جب تک ایک طبقاتی سماج موجود ہے سیاست میں دائیں اور بائیں بازو کی تفریق کو مکمل طور پر کبھی ختم نہیں کیا جا سکتا۔متحارب طبقات اپنے طبقاتی مفادات کا سیاسی اظہار اور ان کے تحفظ کے لیے سیاسی پارٹیوں کی تشکیل نو کرنے کی جانب بڑھیں گے۔ایسے میں ماضی کے تمام سیاسی ڈھانچے زمین بوس ہوتے ہوئے نظر آئیں گے اور انہی کے ملبے سے ایک نئی کشمکش کا آغاز ہوگا۔محنت کش طبقے کی وسیع تر اکثریت کو جیتنے کے لیے لسانی شاونزم اور قومی تعصب کے خلاف واضح مؤقف اختیار کرتے ہوئے طبقاتی جڑت کا پیغام دینا ہوگا۔انسانیت سوز جرائم سے لتھڑی ہوئی ان سیاسی پارٹیوں کا صرف اسی طریقے سے صفایا کیا جاسکتا ہے۔

تحریک انصاف اور ن لیگ

مشرف دور میں بڑے شہروں کے درمیانے طبقے کے ایک قلیل سے حصے میں سیاسی بے چینی نظر آئی۔اس کی بنیادیں اس دوران امریکی امداد کے ذریعے ہونے والی مصنوعی معاشی ترقی کا بلبلہ تھا۔پراپرٹی کے بلبلے سے لے کر ٹیلی کمیونیکیشن اور خدمات کے دیگر شعبوں میں ہونے والا پھیلاؤ تھا۔انہی بنیادوں نے درمیانے طبقے کی ان پرتوں میں بے چینی اور ہلچل پیدا کی اور وہ

پاکستان جیسے پسماندہ ملک میں مغربی طرز کی سرمایہ دارانہ جمہوریت کا خواب دیکھنے لگے۔ اس دوران نظریاتی سیاست پسپائی کا شکار تھی اس لیے 'سول سوسائٹی' کے نام سے ایک نئی اصطلاح متعارف کرائی گئی جو پوش علاقوں میں رہنے والے درمیانے طبقے کے افراد کو مخاطب کرنے کے لیے استعمال ہوئی۔ اس دوران ہمیں عدلیہ کی آزادی کے لیے وکلا کی تحریک نظر آئی جس میں نوجوان وکیلوں کی ایک بڑی تعداد شریک تھی۔ ان نوجوان وکیلوں کی بے چینی کی بڑی وجہ وکالت جیسا 'معزز'' پیشہ اختیار کرنے کے باوجود معاشی مشکلات کی موجودگی تھی۔ یہ نوجوان وکیل ایک طرف اپنے پیشے کے بڑے بڑے مگرمچھوں کو دیکھ کر ان سے مرعوب ہو کر ان جیسا بننے کی خواہش رکھتے تھے دوسری طرف زندگی کی تلخ حقیقتیں انہیں معاشی بحران کی دلدل میں دھکیل رہی تھیں۔ اسی کشمکش نے اپنا اظہار وکلا تحریک میں کیا۔ اس دوران لاہور اور اسلام آباد کے پوش علاقوں میں موجود امیر اور درمیانے طبقے کے افراد کے بچوں کے لیے قائم نجی یونیورسٹیوں کے طلبہ کی مشرف آمریت کیخلاف جمہوریت کی بحالی کی تحریکیں بھی نظر آتی ہیں۔ اس تحریک کے دوران کارکنان کی منرل واٹر سے تواضع کی جاتی تھی اور گرمی سے بچنے کے لیے ٹھنڈی گاڑیوں اور کمروں کا انتظام بھی تھا۔ وجہ یہ تھی کہ روایتی سیاسی پارٹیوں سے اکتائے ہوئی درمیانے طبقے کے ان افراد کے لیے ایک ایسی سیاسی پارٹی درکار تھی جو ان سے مغربی طرز کی سرمایہ دارانہ جمہوریت کے قیام کا وعدہ کرے۔ تحریک انصاف کی شکل میں انہیں یہ پلیٹ فارم ملا اور بڑی تعداد میں ایسے طلبہ اور درمیانے طبقے کے افراد نے اس کا رخ کیا لیکن درمیانے طبقے کی سیمابی کیفیت کے باعث وہ جلد ہی اس سے بھی اوب گئے اور بیزار ہو کر پیچھے ہٹ گئے۔ لیکن اس دوران ریاست کے ایک دھڑے کو اپنے مفادات کے لیے دوسرے دھڑوں پر دباؤ ڈالنے کے لیے ایک رستہ مل گیا اور اپنے بہت سے وفاداروں کو اس پارٹی کا حصہ بنا کر اسے پورے ملک کی عوام پر مسلط کیا گیا۔ میڈیا سمیت دیگر ریاستی اداروں کی پشت پناہی سے اس پارٹی کو ایک سنجیدہ قوت بنانے کی کوشش جاری ہے لیکن ابھی تک یہ عوام کے کسی بھی بڑی پرت کو اپنی جانب متوجہ نہیں کر سکی۔ خیبر پختونخواہ کے دھاندلی زدہ انتخابات کے بعد حکومتوں کی بندر بانٹ میں اسے بھی حصہ دیا گیا جبکہ مرکز میں اسے اپوزیشن کی اداکاری کرنے کی ذمہ داری دی گئی تاکہ عوام پر نام نہاد جمہوریت کے حسن کا دھوکہ مسلط رہے۔ اس تمام عرصے میں کراچی سے لے کر پختونخواہ تک صرف درمیانے طبقے کا ایک چھوٹا سا حصہ ہی اس جانب راغب ہو سکا۔ اس کے علاوہ ایسے لوگ جو سماج میں اپنا رتبہ بڑھانے کے لیے اور''

معزز'' بننے کے لیے کوشاں رہتے ہیں وہ کسی دوسری پارٹی میں جگہ نہ پا کر اس میں شامل ہوتے رہے۔لیکن ابھی تک مزدوروں، کسانوں یا طلبہ کے کسی بھی بڑے حصے نے اس پارٹی کو نہیں اپنایا اور یہ ریاست کے ایک دھڑے کی نمائندہ بن کر رہ گئی ہے۔ مستقبل میں بھی اس کے عوامی حیثیت اختیار کرنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں اور سماج میں ابھرنے والی حقیقی تحریکیں اس فروعی سیاست کو رد کریں گی۔

ن لیگ پنجاب کے تاجروں اور صنعتکاروں کی نمائندہ جماعت رہی ہے اور ان کے مفادات کا تحفظ بھی کرتی رہی ہے۔لیکن اس عرصے میں معاشی بحران نے صنعتوں کو تباہ کیا ہے جبکہ قوت خرید کم ہونے سے تاجر بھی بحران کا شکار ہیں۔سماجی بحران میں درمیانے طبقے کا ایک بڑا حصہ غربت اور معاشی بدحالی کا شکار ہو کر مسلسل نیچے کی جانب سفر کر رہا ہے۔ایسے میں اس طبقے کی کیفیت میں بھی تبدیلی آ چکی ہے اور وہ اب اس سیاسی قیادت کے ساتھ زیادہ عرصے تک وابستہ نہیں رہ سکتا۔ وہ اپنے لیے نئی پارٹیاں تلاش کر رہا ہے جن میں اسے تحریک انصاف کی شکل میں ایک آپشن دی گئی ہے۔اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ تحریک انصاف آنے والے دنوں میں ن لیگ کی سماجی بنیادوں پر نقب لگائے اور وہاں سے اپنی حمایت میں اضافہ کرے لیکن اس کے لیے بھی اسے اپنے پروگرام اور طریقہ کار میں تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔ ضیاالباطل کے دور میں جن طریقوں اور بنیادوں پر ن لیگ ابھری تھی آج وہ بنیادیں موجود نہیں اس لیے وہ طریقے بھی ناکافی ہو چکے ہیں۔ آج درمیانہ طبقہ بھی شدید ہیجان کا شکار ہے اور اسے بھی ایک ایسا پلیٹ فارم درکار ہے جو اسے گزشتہ دہائیوں والا استحکام اور طرز زندگی لوٹانے کا یقین دلا سکے۔امریکہ میں ڈونلڈ ٹرمپ کو ملنے والی ایک بڑی حمایت دائیں بازو کے ایسے افراد پر مشتمل ہے جو اس کے امریکہ کو دوبارہ عظیم بنانے کے نعرے سے متاثر ہوئے ہیں۔وہ بھی سماجی بحران اور بیروزگاری جیسے مسائل سے شدید پریشان ہیں اور اس کا حل انہیں ڈونلڈ ٹرمپ کے پروگرام میں نظر آتا ہے۔ پاکستان میں بھی بیروزگاری میں شدید اضافہ ہوا ہے خاص کر درمیانے طبقے کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بیروزگاری کی شرح ماضی کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ایسے میں ان کی ایک مخصوص تعداد دائیں بازو کے پلیٹ فارم کی جانب رخ کر سکتی ہے جو انہیں ایک مستحکم سماجی معاشی صورتحال کا یقین دلا سکے۔نون لیگ ایک لمبے عرصے سے برسر اقتدار ہونے کے باعث یہ کردار ادا نہیں کر سکے گی۔ ویسے بھی ن لیگ کبھی بھی ایک پارٹی کی شکل اختیار نہیں کر سکی۔ یہ اسٹیبلشمنٹ کے حمایت یافتہ ان افراد کا ٹولہ ہے جو مختلف

تانوں بانوں سے حکمران طبقے کا حصہ ہیں یا ان سے جڑے ہوئے ہیں۔ مشرف دور میں تقریباً انہی افراد نے ق لیگ کے پلیٹ فارم سے اقتدار کی بندر بانٹ میں حصہ لیا تھا۔ اور آج یہ نون لیگ کا حصہ ہیں۔ مستقبل میں یہی یا ان کے خاندان اور طبقے کے افراد ایسی ہی کسی دوسری پارٹی کے ذریعے اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ یہ اسٹیٹس کو کے نمائندے ہیں۔ لیکن ریاست کا بحران اور معیشت کا زوال جہاں اسٹیٹس کو کے لیے خطرہ بنا ہوا ہے وہاں ملک میں چلنے والی وسیع تر عوامی تحریک بھی اس اسٹیٹس کو کو اکھاڑنے کی جانب بڑھے گی اور محنت کش طبقہ اس جرائم پیشہ حکمران طبقے سے تمام مظالم کا انتقام لے گا۔

لیکن اس دوران تحریک انصاف اور نون لیگ کے ملا کھڑے نے میڈیا کو خبروں کی سپلائی جاری رکھی ہوئی ہے گو کہ اس کے سماج پر کوئی بڑے اثرات مرتب نہیں ہو رہے۔ پاناما لیکس سے لے کر ڈان لیکس تک یہ تمام لڑائیاں حکمران طبقے کے مختلف گروہوں کی داخلی لڑائی ہے جس کا محنت کش عوام سے کوئی سروکار نہیں۔ چور کبھی چوروں کا احتساب نہیں کر سکتے اور ایک ایسا نظام جس کی بنیاد ہی چوری پر ہو اس میں کسی کا کیا احتساب ہو سکتا ہے۔ ریاست کے مختلف حصے ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کے لیے اور اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لیے ان پارٹیوں کو استعمال کرتے ہیں۔ پارٹیوں کے لیڈر اور نام نہاد موقع پرست کارکن بھی اس مقصد کے لیے استعمال ہونے کو تیار ہیں۔ وہ اس کے ذریعے اپنا سماجی رتبہ بڑھا کر لوٹ مار کے کاروبار میں وسعت کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ محنت کش عوام کا ان لڑائیوں سے کوئی سروکار نہیں اور وہ ان کی حقیقت کو سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی انتخابات میں ووٹ مانگے تو بھی وہ جانتے ہیں کہ اس ووٹ کی کیا اوقات ہے۔ اس سے گھی کا ڈبہ یا آٹے کا کنستر ہی آ سکتا ہے۔ اگر محنت کشوں کو یقین ہو کہ ان کے اس ووٹ سے کوئی حقیقی تبدیلی آئے گی اور ان کی غربت اور محرومی کا خاتمہ ہو جائے گا تو وہ کسی بھی دباؤ یا لالچ میں آ کر یہ ووٹ نہیں بیچیں گے۔ 1970ء کے انتخابات میں ہمیں ایسی ہی صورتحال نظر آئی تھی جب ایک انقلاب کو زائل کرنے کے لیے انتخابات کروائے گئے تھے۔ اس وقت ظالم ترین جاگیرداروں، وڈیروں، خانوں اور سرمایہ داروں کے مقابلے میں محنت کشوں نے مزارعوں اور عام مزدوروں کو ووٹ دے کر کامیاب کرایا تھا۔ آج اسی قسم کا یقین دوبارہ ایک تحریک کے ذریعے ہی قائم ہو سکتا ہے جو محنت کشوں کو یقین دلائے کہ وہ برسر اقتدار آ کر انہیں روٹی، کپڑا، مکان، علاج، تعلیم اور روزگار فراہم کرے گی۔ آج عوام کی اکثریت کو اس نعرے پر یقین دلانے کی صلاحیت بھی کسی

پارٹی میں نہیں، اس پر عملدرآمد تو دور کی بات ہے۔ ایسے میں ریاست کے دھڑوں کی لڑائی میں نظریات سے عاری سیاست میڈیا اور بھونڈی پارٹیوں کے ذریعے نہ صرف مسلط کی جاتی رہے گی بلکہ اس میں شدت آئے گی۔

ایسے میں ایک سوال کثرت سے پوچھا جاتا ہے کہ اگلے الیکشن کون جیتے گا؟ اور اس کے ساتھ ہی تجزیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن ان تمام تجزیوں میں ایک بنیادی خیال یہ ہوتا ہے کہ حالات جوں کے توں رہیں گے۔ جدلیاتی مادیت پر یقین رکھنے والے جانتے ہیں کہ سماج میں حقیقی تبدیلی کے عمل کو کسی بھی صورت روکا نہیں جا سکتا اور سطح سے نیچے جاری یہ عمل جلد یا بدیر سطح پر اپنا اظہار کرتا ہے۔ اسی طرح آئندہ انتخابات کا سوال بھی اس تحریک کے تناظر کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ اگر پاکستان میں محنت کش طبقے کی ایک بڑی تحریک موجود ہوئی تو انتخابات کے اس ناٹک کی شاید ضرورت ہی نہ پڑے لیکن صرف تحریک کو زائل کرنے کے لیے انتخابات کروائے جا سکتے ہیں ورنہ پاکستان میں ابھرنے والی تحریک ریاست اور اس کے تمام تر بورژوا جمہوری اداروں کو اکھاڑ پھینکنے کی طرف جائے گی۔ اس دفعہ پھر عوامی تحریک کو انقلابی سرکشی کی بجائے انتخابات کی جانب لیجانا بہت بڑی غداری کے مترادف ہوگا۔ لیکن اگر تحریک تاخیر کا شکار ہوتی ہے تو انتخابات کا فیصلہ ریاست کے مختلف دھڑوں اور سامراجی ممالک کے باہمی تضادات اور سماج کی عمومی کیفیت سے ہوگا۔ حکمران طبقات کوشش کریں گے کہ وہ اسٹیٹس کو کو برقرار رکھنے کے لیے اس پارلیمانی ناٹک کو مزید کھینچتے چلے جائیں۔ لیکن ساتھ ہی فوج کی آمد کا خطرہ ڈرامے میں سنسنی پیدا کرنے کے لیے موجود رہے گا۔ جبکہ حقیقت میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ صدر یا وزیراعظم باوردی ہو یا بغیر وردی کے۔ ہر دو صورت میں وہ انہی سامراجی آقاؤں کا غلام رہے گا اور انہی کی پالیسیوں کو جاری رکھنے کا پابند ہوگا۔

مذہبی جماعتیں اور بنیاد پرستی

ضیا الباطل کے رجعتی دور میں امریکی پشت پناہی سے ان پارٹیوں کی بڑھوتری نظر آتی ہے۔ سماج کے پسماندہ ترین حصوں اور پچھڑی ہوئی پرتوں کی حمایت کے ساتھ انہوں نے ریاستی پشت پناہی سے اپنی سیاست جاری رکھی ہے۔ جماعت اسلامی اور فضل الرحمان کی پارٹیوں سے لے کر لشکر طیبہ، مجلس وحدت المسلمین اور سپاہ صحابہ تک یہ پارٹیاں کبھی بھی وسیع تر عوامی حمایت حاصل

نہیں کرسکیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق یہ کبھی بھی پانچ فیصد سے زائد ووٹ حاصل نہیں کرسکیں لیکن اس کے باوجود میڈیا سے لے کر پارلیمنٹ کے ناٹک تک میں انہیں ایک اہم عنصر کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ان پارٹیوں کی بنیاد سعودی عرب، ایران اور دیگر ممالک کی فنڈنگ سے چلنے والے ہزاروں کی تعداد میں مدرسے ہیں۔ ان مدرسوں میں سماج کے پسماندہ ترین حصوں سے آنے والے غربت کی نام نہاد لکیر سے بھی کہیں نیچے رہنے والے بچے ہوتے ہیں جنہیں یہ ملاّ اپنے مالی مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے تاجروں سے لے کر چھوٹے صنعتکاروں تک درمیانے طبقے کے کچھ حصوں میں ان کی حمایت موجود رہی ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان میں کالے دھن کی معیشت کی بڑھوتری کے باعث ان کی جڑیں سماج کے رجعتی حصوں میں پھیلی ہیں۔ ان میں تبلیغی جماعت کی مقبولیت میں سب سے زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ اس جماعت نے کبھی بھی اپنے سیاسی عزائم کا کھل کر اظہار نہیں کیا لیکن محنت کشوں کی تحریکوں کو زائل کرنے اور انہیں ان ظالم حکمرانوں کو ازلی اور ابدی سمجھ کر دنیاوی مسائل سے کنارہ کشی اختیار کرنے پر مائل کرنے کے لیے یہ اپنا کردار بھرپور طریقے سے ادا کرتے رہتے ہیں۔ سیاست کی عمومی غلاظت سے بیزاری کے باعث بھی اس بظاہر غیر سیاسی جماعت کی جانب رجحان موجود ہے۔ لیکن جب مذہب کے لبادے میں ان مزدور دشمن نظریات کو سیاست میں آزمایا جائے گا تو ان کی حقیقی قوت کی قلعی کھل جائے گی۔

آنے والے عرصے میں باقاعدہ معیشت کے بحران اور سکڑنے کے ساتھ ساتھ بے قاعدہ اور کالے دھن کی معیشت کے پروان چڑھنے کے واضح امکانات موجود ہیں۔ اس کے علاوہ سعودی عرب اور ایران کے تضادات زیادہ شدت کے ساتھ ابھر کر سامنے آئیں گے۔ ایسے میں یہ جماعتیں زیادہ بڑا کردار ادا کرنے کی کوشش کریں گی۔ مال کی فراوانی ان میں مزید ٹوٹ پھوٹ کا باعث بنے گی۔ لیکن سیاست کے میدان میں پسماندہ اور پچھڑی ہوئی پرتوں کی وسیع حمایت لینے کے لیے بھی ان کے پاس کوئی سیاسی پروگرام نہیں۔ دوسرے ان کی پاکبازی کا نقاب کب کا اتر چکا ہے اور عوام ان کی گھناؤنی حقیقت جان چکے ہیں۔ خودکش حملوں اور دہشت گردی کی وارداتوں نے ان کی حمایت میں بڑے پیمانے پر کمی کی ہے۔ رہی سہی کسر طالبان نے پوری کردی ہے جن کی یہ تمام پارٹیاں کسی نہ کسی شکل میں حمایت کرتی ہیں جبکہ عوام ان سے نفرت کرتے ہیں۔ جنوبی پنجاب اور جنوبی پختونخوا کے پسماندہ ترین علاقوں سے لے کر کراچی تک ان پارٹیوں کی حمایت میں کمی آرہی ہے اور وہ صرف ریاستی پشت پناہی اور پیسے کے بل بوتے پر اپنا اثر ورسوخ قائم رکھے

ہوئے ہیں۔سوویت یونین کے خلاف امریکی سامراج کی جنگ کو مذہبی نظریات کی بنیادیں فراہم کر کے ان پارٹیوں نے اپنی قیمت وصول کی اور ہزاروں ملاّ سائیکل سے لینڈ کروزر تک پہنچ گئے۔ آج بھی اپنی مراعات کو برقرار رکھنے کے لیے وہ مذہب کی تجارت کو جاری رکھے ہوئے ہیں خواہ اس کے لیے انہیں معصوم افراد کے خون سے ہولی کیوں نہ کھیلنی پڑے۔

آنے والے عرصے میں ریاست اپنے بحران کے باعث ان قوتوں کو زیادہ بڑے پیمانے پر استعمال کرنے کی کوشش کرے گی اور انہیں ان کے حقیقی قد سے کئی گنا زیادہ بڑا بنا کر پیش کیا جائے گا۔موجودہ سماجی کیفیت میں ریاست نے فرقہ وارانہ تعصّبات کو سماج پر مسلط کرنے کی کوشش کی لیکن کہیں بھی انہیں وہ زرخیز زمین نہیں مل سکی جہاں یہ فرقہ وارانہ خونریزی سماج میں سرایت کر سکے۔راولپنڈی سے لے کر کوئٹہ تک ہر جگہ ان تعصّبات کو بھڑکایا گیا لیکن عوام کی بڑی اکثریت، جو اس وقت زندگی کی بنیادی سہولیات کے لیے تگ و دو کر رہی ہے، اس نے ان تعصّبات کو سیاسی رنگ دینے کی کوششوں کو رد کیا ہے۔آنے والے دنوں میں سماج کے پسماندہ اور رجعتی حصوں کو متوجہ کرنے کے لیے زیادہ خونریز اور سفاک قوتوں کو پروان چڑھایا جائے گا۔محنت کشوں کی تحریکوں کو توڑنے کے لیے انہیں پہلے بھی استعمال کیا جاتا رہا ہے اور آئندہ بھی استعمال کیا جائے گا۔مشرقِ وسطیٰ کی بہت سے ممالک میں ان قوتوں کا کردار واضح طور پر نظر آیا ہے اور کس طرح یہ قوتیں مختلف سامراجی قوتوں کی لڑائی کا حصہ بنتی ہیں۔وہی کچھ یہاں بھی دہرایا جا سکتا ہے لیکن اس سے پہلے محنت کش طبقہ یہاں کے حکمران طبقے کے خلاف ایک فیصلہ کن لڑائی میں اترے گا۔اس سے پہلے ان قوتوں کے وسیع بنیادیں حاصل کرنے کا کوئی امکان نہیں۔ایک انقلاب کی پسپائی ہی ان قوتوں کو آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کر سکتی ہے۔

قوم پرست پارٹیاں

پاکستان میں سرمایہ داری کبھی بھی ترقی پسند کردار ادا کرتے ہوئے اپنے تاریخی فرائض ادا نہیں کر سکی۔نہ ہی یہاں جاگیرداری کا مکمل خاتمہ کیا جا سکا اور نہ ہی آزاد پارلیمنٹ قائم ہوئی۔اسی طرح یہاں ایک جدید قوم کی تشکیل بھی نہیں ہو سکی۔آج بھی پاکستان مظلوم قومیتوں کا جیل خانہ ہے اور قومی محرومی بڑے پیمانے پر موجود ہے۔پاکستان کی ریاست نے اس قومی محرومی کو ختم کرنے کی بجائے اسے محنت کشوں کی جڑت کو توڑنے کے لیے اور اپنی حکمرانی کو جاری رکھنے کے لیے

استعمال کیا ہے۔ اس بوسیدہ ریاست اور غلام معیشت سے یہ کبھی بھی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ پسماندہ علاقوں میں ترقی اور خوشحالی لائے گی اور وہاں قومی محرومی کا خاتمہ کرے گی۔ اس لیے وقت کے ساتھ ساتھ اس محرومی میں اضافہ ہی ہوا ہے اور آنے والے عرصے میں مزید ہوگا۔ اسی قومی جبر کیخلاف اس ملک کی ستر سالہ تاریخ میں قومی آزادی کی بہت سی تحریکیں موجود رہی ہیں جنہوں نے اس ریاست کے سامراجی کردار کو چیلنج کیا ہے۔ انہی تحریکوں نے بہت سی قوم پرست پارٹیوں کو جنم دیا ہے جو ایک لمبے عرصے تک اسی قومی محرومی کے جذبات پر سیاست کرتی رہی ہیں۔ ان قوم پرست پارٹیوں کو سٹالنزم نے نہ صرف نظریاتی بنیادیں بھی فراہم کی تھیں، جس کے تحت قومی آزادی کو طبقاتی کشمکش سے کاٹ کر ایک حتمی مقصد بنا کر پیش کیا گیا بلکہ بہت سی سٹالنسٹ پارٹیاں زوال پذیر ہو کر قوم پرست پارٹیاں بن کر رہ گئیں۔ لیکن خود ان پارٹیوں کے لیڈروں نے اپنے اس مقصد سے بھی غداری کی اور سامراجی ریاست کے انہی غلیظ ترین حکمرانوں کی گود میں جا کر بیٹھ گئے۔ آج بھی بلوچستان میں پشتونخوا ملی عوامی پارٹی اور نیشنل پارٹی اقتدار کا حصہ ہیں جبکہ اس سے پہلے کے پانچ سالوں میں عوامی نیشنل پارٹی اقتدار کا حصہ رہی ہے۔ سندھ کے بہت سے قوم پرستوں نے تو اپنے آپ کو نون لیگ میں ضم ہی کر دیا۔ لیکن اتنی بڑی سیاسی قربانی کے باوجود انہیں اقتدار میں حصہ نہیں مل سکا۔ حکومت میں شامل ہو کر ان پارٹیوں نے انہی سامراجی پالیسیوں کو لاگو کیا ہے جنہیں پنجاب کے غلیظ ترین سرمایہ داروں نے مسلط کیا تھا۔ اس سے واضح ہو چکا ہے کہ قومی محرومی کی سیاست کرنے کا حتمی مقصد اقتدار میں حصہ لینا ہے اور برسر اقتدار آ کر ''ذمہ داری'' کا ثبوت دیتے ہوئے انہی پالیسیوں کا تسلسل قائم رکھنا ہے۔ ایک لمبے عرصے تک یہ پارٹیاں کالا باغ ڈیم کے گرد سیاست کرتی رہیں۔ حکمران طبقات بھی قومی تعصب کو ابھارنے کے لیے اس ایشو کو استعمال کرتے رہے ہیں جو آج ایک نان ایشو بن چکا ہے۔ اس منصوبے سمیت تمام منصوبوں میں ریاست کا سامراجی کردار واضح ہوتا ہے۔ خواہ لاہور میں میٹرو بس یا اورنج ٹرین ہو یا گوادر کی بندرگاہ۔ چونکہ اس ریاست کی بنیاد ہی مظلوم قومیتوں کے استحصال پر موجود ہے اس لیے اس کی تمام پالیسیوں اور عمل میں اس کا سامراجی کردار جھلکتا ہے۔

افغان مہاجرین کا ایشو اس کی تازہ مثال ہے۔ بھارت اور افغانستان کے امریکی پشت پناہی سے بڑھنے والے قریبی تعلقات سے پاکستان کی ریاست کے سامراجی عزائم کو دھچکا لگا ہے۔ یہ ایک لمبے عرصے سے افغانستان کو اپنا پانچواں صوبہ بنانے کی کوشش کرتے رہے ہیں اور اس کے

لیے نام نہاد ''تزویراتی گہرائی'' کی ایک پالیسی پر کاربند رہے ہیں۔اب اس محاذ پر پسپائی کے بعد سارا غصہ افغان مہاجرین پر نکالا جا رہا ہے اور تیس لاکھ کے قریب یہاں رہنے والے مہاجرین کو زبردستی واپس بھیجا جا رہا ہے۔ اس کے لیے بڑے پیمانے پر گرفتاریاں شروع ہو چکی ہیں اور لاکھوں افراد کے شناختی کارڈ بلاک کر دیے گئے ہیں۔اس کا مقصد جہاں افغان حکومت اور امریکہ پر دباؤ ڈالنا ہے وہیں دنیا میں مہاجرین کا بوجھ اٹھانے کا واویلا کرنا ہے تاکہ امداد کے نام پر ڈالروں کی آمد کا سلسلہ کسی صورت شروع ہو سکے۔اس سے پہلے بھی پاکستان کی ریاست امدادی رقوم کو ہڑپ کرتی رہی ہے۔ 2005ء کے زلزلے کے بعد آنے والی امدادی رقوم ہوں یا مہاجرین کے نام پر آنے والی امداد، پاکستان کی ریاست ان کو اپنے خسارے پورے کرنے کے لیے استعمال کرتی رہی ہے۔اس دوران افغان مہاجرین جو پاکستان کے سامراجی عزائم کے باعث دربدر ہوئے انتہائی ذلت آمیز زندگی گزارنے پر مجبور رہے ہیں۔اب ان کی دوسری اور تیسری نسل اسی غربت اور محرومی میں زندگی گزار رہی ہے۔ یہاں کے ''محبِّ وطن'' سرمایہ داروں نے ان کی سستی مزدوری کا بڑے پیمانے پر استحصال کیا۔ان اجڑے ہوئے لوگوں کی غربت اور بربادی ان سرمایہ داروں کے لیے کم ترین اجرت پر مزدور فراہم کرنے کا باعث بنی جنہوں نے انہیں خوب لوٹا۔انہی افغان مہاجرین کے خون اور پسینے سے یہاں پر بہت سی صنعتوں اور کاروباروں کا پہیہ چلتا رہا اور اب انہیں بوجھ قرار دے کر دوبارہ ملک بدر کیا جا رہا ہے۔اس ریاست کے خصی پن کی حالت تو یہ ہے کہ ستر سال سے کراچی میں رہنے والے ہزاروں بنگالیوں کو پاکستان کی شہریت نہیں دے سکی اس نے بلوچستان کا قومی مسئلہ کیا حل کرنا ہے۔کارل مارکس نے کہا تھا کہ محنت کشوں کا کوئی وطن نہیں ہوتا اور آج افغان مہاجرین کا دنیا بھر میں کوئی وطن نہیں۔دوسری طرف بلوچ اور سندھی قوم پرستوں نے بھی افغان مہاجرین کیخلاف ہونے والی کاروائیوں کی حمایت کر کے ریاستی آشیر باد حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کے باوجود ان مہاجرین کی نہ تو مکمل واپسی ہو سکتی ہے اور نہ یہاں کے حکمران انہیں چین سے جینے دیں گے۔ بلکہ انہیں اپنی لڑائیوں میں استعمال کرنے کی کوشش کریں گے۔پشتون قوم پرست ان کی حمایت کا ناٹک کر کے اپنا سیاسی وزن بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن دوسری جانب وہ اس ریاست کے اداروں اور سامراجی قوتوں کی غلامی کا طوق بھی پہنے ہوئے ہیں۔ایسے میں ان سے کسی مزاحمتی سیاست کی توقع کرنا ممکن نہیں۔

پچھلے عرصے میں ان پارٹیوں کے جلسوں میں بڑے پیمانے پر شرکت دیکھنے میں آئی ہے جس

کی وجوہات یقیناً ان کے عوام دشمن کردار کی حمایت نہیں ہے۔ 8 اگست کو کوئٹہ میں ہونے والے سانحہ کے بعد پشتونخوا ملی عوامی پارٹی ایک بڑا جلسہ کرنے میں کامیاب ہوئی، اسی طرح بی این پی (مینگل) نے خضدار اور نوشکی میں بڑے جلسے کیے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ سماج میں سیاسی گھٹن ہے جس میں کوئی بھی پارٹی مسائل کا سیاسی حل دینے سے قاصر ہے۔ 8 اگست کے سانحہ کے بعد کوئٹہ میں ہر آنکھ اشکبار تھی اور لوگ اس دہشت گردی کیخلاف ایک سیاسی لڑائی لڑنے کے لیے بیتاب تھے۔ لیکن کسی سیاسی پارٹی نے کوئی پروگرام اور لائحہ عمل نہیں دیا۔ ان جلسوں میں لوگ اپنے سوال لے کر جاتے ہیں لیکن ان قیادتوں کے پاس کوئی جواب نہیں۔ اس وقت قوم پرست پارٹیوں کی تمام مروجہ قیادتیں ریاستی آشیر باد سے ہی سیاست کرنا چاہتی ہیں۔ عوام کے حقیقی مسائل کو اجاگر کر کے مزاحمت کی سیاست کوئی بھی کرنے کے لیے تیار نہیں۔

بہت سے قوم پرستوں نے خصوصاً بلوچستان میں قومی آزادی کے لیے مسلح جدوجہد کا رستہ اپنایا جس کی محدودیت اب کھل کر واضح ہو چکی ہے۔ عوام کے وسیع تر حصے کی شمولیت کے بغیر بندوقوں کے ذریعے چند گوریلوں کی قومی آزادی کی لڑائی مہم جوئی کے سوا کچھ نہیں۔ ماضی میں سوویت یونین کی موجودگی کے باعث اس مسلح جدوجہد میں کسی حد تک بائیں بازو کے نظریات موجود ہوتے تھے لیکن مشرف دور میں شروع ہونے والی اس بغاوت میں ان کا بھی فقدان نظر آیا۔ ہزاروں دلیر اور جرات مند نوجوانوں کی بلی چڑھانے کے بعد اب یہ قیادتیں امریکہ اور ہندوستان کی حمایت سے آزادی حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ ایک نے تو مودی کی بنیاد پرست حکومت سے سیاسی پناہ کی اپیل بھی کر دی ہے۔ یہ عمل خود ان شہیدوں کے خون سے غداری ہے جنہوں نے ایک سامراجی قوت سے لڑتے ہوئے جان دی۔ ایک سامراجی قوت سے آزادی حاصل کرنے کے لیے دوسری اتنی ہی یا اس بھی زیادہ رجعتی سامراجی قوتوں سے آزادی کی اپیل کرنا قومی آزادی کی تحریک کی تضحیک ہے اور ان قیادتوں کے حقیقی کردار کو بے نقاب کرتی ہے۔ ان میں سے کئی قوم پرستوں نے محنت کشوں کی طبقاتی جڑت کے خلاف جرائم سرزد کرتے ہوئے دوسری قوموں کے محنت کشوں کو بلوچستان میں قتل کیا ہے۔ اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قومی آزادی کی جدوجہد کو پورے خطے میں جاری محنت کش طبقے کی تحریکوں سے جوڑا جائے اور اس سرمایہ دارانہ نظام کیخلاف ایک بڑی لڑائی کا حصہ بنا جائے۔ صرف ایک سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے ہی تمام مظلوم قومیتوں کو ریاست کے سامراجی جبر سے نجات مل سکتی ہے اور

معاشی آزادی بھی حاصل ہوسکتی ہے۔

آنے والے عرصے میں قوم پرست قیادتیں مزید زوال پذیر ہوکر ریاست کے دھڑوں کی لڑائی کا حصہ بن کر مزید رسوا ہوں گی۔ بہت سے قوم پرستوں نے مذہبی بنیاد پرستوں اور ایم کیو ایم کی طرز پر ریاستی آشیر باد سے مجرمانہ کاروائیوں کا بھی آغاز کر دیا ہے۔ اس میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ لیکن دوسری جانب گلگت بلتستان میں ہمیں ایک عوامی تحریک بھی نظر آئی جس نے ضروری اشیا پر سبسڈی کے خاتمے کے حکومتی فیصلے کو واپس لینے پر مجبور کیا۔ اس تحریک کی قیادت کوئی بھی پارٹی نہیں کر رہی اور یہ ابھی تک کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ اس تحریک میں کمیٹیوں کی شکل میں ایسے افراد موجود ہیں جو کسی بھی سیاسی پارٹی سے وابستہ نہیں۔ اس تحریک کو فرقہ وارانہ بنیادوں پر زائل کرنے کی بھی کوشش کی گئی لیکن اسے توڑا نہیں جا سکا۔ اب اس نے سی پیک کے خلاف احتجاج کا آغاز کر دیا جس میں پورے گلگت کو ایک دن کے لیے بند کر دیا گیا۔ اس کیخلاف ریاست کی جانب سے بڑے پیمانے پر کریک ڈاؤن کا آغاز ہو چکا ہے۔ اسی طرح فاٹا کے طلبہ سے لے کر کشمیر کے پیرامیڈیکس تک مختلف تحریکیں موجود ہیں جو حکومتی پالیسیوں کو چیلنج کر رہی ہیں۔ آنے والے دنوں میں ان کے پھیلنے کے امکانات ہیں جو سماج کے بڑے حصوں کو اپنے ساتھ جوڑنے کی طرف بڑھیں گے۔ آنے والے دنوں میں سی پیک یا دیگر حکومتی اقدامات کیخلاف ایسی تحریکیں ابھر سکتی ہیں جو مروجہ پارٹیوں سے باہر اپنا اظہار کریں گی اور نئی سیاسی تشکیلات کے لیے مواد فراہم کریں گی۔

7۔تحریک کا تناظر

کشمیر کی تحریک

اس وقت بھارتی مقبوضہ کشمیر میں ایک بہت بڑی عوامی تحریک جاری ہے۔ اس سال آٹھ جولائی کو شروع ہونے والی یہ تحریک چار ماہ مکمل ہونے کے باوجود پوری شدت کے ساتھ جاری ہے اور پورے کشمیر میں پھیل چکی ہے۔ تمام تجزیہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ یہ کشمیر کی تاریخ کی سب سے بڑی تحریک ہے۔ کشمیر کے نوجوانوں کی اس بغاوت نے ہندوستان اور پاکستان کے سامراجی حکمرانوں کی نیندیں حرام کر دی ہیں اور وہ اس مخمصے میں پھنس چکے ہیں کہ اس تحریک سے کیسے نپٹا جائے۔ حزب المجاہدین کے ایک کمانڈر برہان وانی کے قتل سے شروع ہونے والی تحریک نے کشمیر کے نوجوانوں میں موجود بیروزگاری اور قومی جبر کیخلاف نفرت کو بھڑکا دیا اور انہوں نے ہندوستان کی قابض فوج کیخلاف بڑے پیمانے پر احتجاجوں اور جلوسوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہ نوجوان آزادی کا نعرہ لگاتے ہوئے ہندوستان کی افواج پر پتھراؤ کرتے ہیں جس کے جواب میں فوج انہیں خاموش کرانے کے لیے شیلنگ کرتی ہے۔ اب تک سو سے زائد افراد ہلاک ہو چکے ہیں جبکہ سولہ ہزار افراد زخمی ہوئے ہیں۔ ان چار ماہ کے دوران چوبیس سو ایف آئی آرز درج کی گئی ہیں جبکہ دس ہزار افراد کو گرفتار کیا گیا ہے۔ بہت سے افراد کو سپیشل پاور ایکٹ کے تحت گرفتار کیا گیا ہے جس کے مطابق کسی بھی شخص کو بغیر کسی الزام کے دو سال تک زیر حراست رکھا جا سکتا ہے۔ دس ہزار گرفتار افراد میں سے پندرہ سو ابھی تک حوالات یا جیلوں میں ہیں جبکہ باقی کو ضمانت پر رہا کیا گیا ہے۔ ان چار ماہ میں 2240 سے زائد احتجاج یا سکیورٹی فورسز سے جھڑپوں کے واقعات ہوئے ہیں جو اس تحریک کی شدت کو واضح کرتے ہیں۔ اس تحریک کو کچلنے کے لیے ہندوستان کی ریاست پیلٹ گن کا استعمال کر رہی ہے جس کے ذریعے لوہے کے چھرے مظاہرین پر فائر کیے جاتے ہیں۔ یہ چھرے مظاہرین کے جسموں میں گھس جاتے ہیں، چہروں کو مسخ کر دیتے ہیں جبکہ آنکھ میں لگنے سے بینائی ضائع یا کمزور ہو جاتی ہے۔ اب تک 1600 افراد کے چہرے اس پیلٹ گن سے

مسخ ہو چکے ہیں جبکہ 1100 افراد کی بینائی متاثر ہوئی ہے۔ پندرہ جولائی سے پوری وادی میں کرفیو لگا دیا گیا جو مسلسل جاری ہے اور کشمیر کی تاریخ کا سب سے طویل کرفیو بن چکا ہے، اس سے پہلے 72 دن مسلسل کرفیو کا ریکارڈ تھا۔ کرفیو کے دوران موبائل نیٹ ورک اور انٹرنیٹ کو بھی بند کر دیا گیا۔ کشمیر رائزنگ کے نام سے ایک اخبار کو بھی بند کر دیا گیا ہے جبکہ اس دوران ایک سماجی کارکن کو بیرون ملک جانے سے روک کر نظر بند بھی کر دیا گیا۔

اس تحریک کی خاص بات یہ ہے کہ یہ ماضی کی طرح صرف سری نگر یا بڑے شہروں میں موجود نہیں بلکہ دور دراز کے دیہاتوں میں بھی اسی شدت کے ساتھ موجود ہے۔ جنوبی کشمیر کے دیہاتی علاقوں میں اس تحریک کی شدت نے تمام تجزیہ نگاروں کو حیران کر دیا ہے اور ایک سماجی کارکن سنجے کاک نے الجزیرہ سے بات کرتے ہوئے اسے کسانوں کی بغاوت قرار دے دیا۔ عمومی طور پر کہا جاتا تھا کہ شہروں کے نوجوان بھارتی فوج کے جبر کیخلاف زیادہ متحرک ہوتے ہیں لیکن اس دفعہ دیہاتوں میں نوجوانوں کے علاوہ خواتین اور بچے بھی اس تحریک میں شامل ہیں۔ اس تحریک کے دوران بہت سے کم عمر نوجوانوں کو بھی قتل کیا گیا ہے جبکہ سینکڑوں زخمی ہوئے ہیں۔ اس تحریک کے دوران کم عمر ترین قتل ہونے والے نوجوانوں میں گیارہ سالہ ناصر شفیع قاضی، بارہ سالہ دانش سلطان ہار واور تیرہ سالہ جنید احمد شامل ہیں۔ ساتویں جماعت کے طالب علم جنید کو اس وقت قتل کیا گیا جب وہ اپنی والدہ کے ساتھ گھر کے دروازے میں کھڑا تھا۔ اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جن میں نوجوان آزادی کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔

اس تحریک کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک لاکھ افراد پر مشتمل کشمیر کی پولیس مکمل طور پر مایوسی کا شکار ہے اور بہت سے پولیس والے مستعفی ہو چکے ہیں۔ پولیس والوں کے گھر والے اور خاندان والے انہیں شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور یہ ایک قسم کے سماجی بائیکاٹ کا شکار ہیں۔ مظاہرین پر شیلنگ کے احکامات جاری کرنے والے کچھ افسروں کو معافی مانگنی پڑی جبکہ ایک سری نگر میں واقع اپنا گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گیا کیونکہ اس کے باہر دیوار پر کسی نے ''قاتل'' لکھ دیا تھا۔ تقریباً ایک درجن پولیس سٹیشنوں پر پتھراؤ اور جلاؤ گھیراؤ ہوا ہے جبکہ چار کو مکمل طور پر جلا دیا گیا ہے۔ ماضی میں پولیس کی اس مایوسی اور مشکل کا حل سپیشل آپریشن گروپ کے نام سے فورس بنا کر کیا گیا تھا۔ جس میں لائن آف کنٹرول کے قریب شمالی علاقوں سے لوگوں کو بھرتی کر کے کشمیر کے عوام پر مظالم ڈھائے گئے تھے۔ لیکن اب اس کے خلاف بھی شدید نفرت ہے

اورنوجوان ہرحدتک جانے کے لیے تیار ہیں۔

چار ماہ تک مسلسل کرفیواور کاروبار زندگی معطل ہونے کی صورت میں تجزیہ نگار حیران ہیں کہ لوگ کیسے زندہ ہیں اور اپنی جدوجہد کو کیسے جاری رکھے ہوئے ہیں۔اس عرصے کے دوران ہر جگہ پر عوام کی یکجہتی دیکھنے میں آئی ہے جس میں انہوں نے مشترکہ کچن، مشترکہ سکولوں اور میڈیکل اور ریلیف کا کام باہمی اشتراک سے کرنا شروع کر دیا ہے۔ بہت سے علاقوں کا کنٹرول ان سنگباز نوجوانوں نے سنبھال لیا ہے جو سڑکوں پر نا کے لگا کر آنے والوں کی شناخت دیکھتے ہیں اور مشتبہ افراد کیخلاف کاروائی کی جاتی ہے۔اسی طرح مختلف علاقوں میں شٹر ڈاؤن کی کال پر مکمل عملدرآمد کی نگرانی کی جاتی ہے اور اس کی خلاف ورزی کرنے والے کیخلاف کاروائی کی جاتی ہے۔دوسری جانب بھارتی افواج بھی مختلف طریقوں سے ان سنگبازوں کو روکنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں لیکن تمام تر جبر کے باوجود اس تحریک کو ابھی تک کمزور نہیں کیا جا سکا۔

بھارتی فوج کی شمالی کمانڈ کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل ڈی ایس ہودا نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے کہ کشمیر میں بھارت کے پاس کوئی دلیل نہیں رہ گئی۔اس نے کہا کہ ہمیں پیچھے ہٹ کر دوبارہ سر جوڑنے چاہئیں۔اس نے تسلیم کیا کہ صرف فوج کے ذریعے کشمیر کو ساتھ جوڑ کے نہیں رکھا جا سکتا۔اسی طرح ہندوستان کے حکمران طبقے کے سنجیدہ حصے اس تحریک کی گہرائی اور شدت کو بھانپ رہے ہیں اور اس سے نپٹنے کے لیے ماضی کی نسبت نئے رستے تلاش کر رہے ہیں۔ بھارتی فوج کی ناکامی کے علاوہ یہ کشمیر میں برسراقتدار محبوبہ مفتی کی قیادت میں پی ڈی پی اور بی جے پی کی مخلوط حکومت کی بھی ناکامی ہے۔نیشنل کانفرنس اور کانگریس کی عمر عبداللہ کی سربراہی میں مخلوط حکومت کے خاتمے کے بعد پی ڈی پی سے امیدیں وابستہ تھیں اور وادی میں اسے بہت بڑی اکثریت ملی تھی۔لیکن اس نے انتخابی مہم کے دوران جس پارٹی کو سب سے زیادہ شدید تنقید کا نشانہ بنایا اسی کے ساتھ مخلوط حکومت بنا لی۔اسی غداری کے باعث آج وہ اس تحریک میں کسی بھی قسم کا فعال کردار ادا کرنے کے قابل نہیں بلکہ خود ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔سری نگر سے اس پارٹی کے ممبر لوک سبھا طارق حمید کارا نے پارٹی کی بنیادی رکنیت اور لوک سبھا سے استعفیٰ دے دیا ہے۔اپنے استعفیٰ میں اس نے کہا ہے کہ وہ پارٹی کے بی جے پی کے ساتھ الائنس پر پہلے ہی ڈیڑھ سال سے تنقید کر رہا تھا اور اب اس تحریک پر ڈھائے جانے والے مظالم پر خاموشی کے نتیجے میں مستعفی ہو رہا ہے۔دوسری جانب علیحدگی پسند حریت کانفرنس نہ صرف ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے

بلکہ اس تحریک میں اس کا کوئی کردار نہیں۔ پاکستان اور بھارت دونوں ریاستوں نے حریت راہنماؤں کے ذریعے اس تحریک میں مداخلت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن کشمیر کے سنگباز نوجوان کسی بھی مروجہ سیاسی لیڈر کی قیادت تسلیم نہیں کر رہے۔ اس تحریک کی سب سے خاص بات اس کا خودرو ہونا اور بغیر کسی مرکزی قیادت کے اتنے لمبے عرصے تک جاری رہنا ہے۔ یہ تحریک کے لیے مشکلات بھی پیدا کرتا ہے لیکن ابھی تک بغیر کسی قیادت کے تحریک جاری ہے۔ ان نوجوانوں کا بنیادی مطالبہ آزادی ہے۔ وہ ہندوستان کے جبر سے مکمل آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن قومی آزادی کے ان جذبات کی بنیادیں سماجی اور معاشی بحران میں ہیں جہاں نوجوانوں خاص کر تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بڑے پیمانے پر بیروزگاری ہے۔ جموں کشمیر کی ایک کروڑ بیس لاکھ آبادی کا 70 فیصد 31 سال سے کم عمر نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ 2011ء میں ایک امریکی ادارے مرسی کارپس کی رپورٹ کے مطابق کشمیر کے 48 فیصد نوجوان بیروزگار ہیں۔ اپنے تاریک مستقبل میں ان کے لیے روشنی کی واحد کرن یہی تحریک ہے جس کے لیے بہت سے نوجوان اپنی زندگیاں قربان کر رہے ہیں۔ اس تحریک کے لیے سب سے بڑا خطرہ اس پر پاکستان کی سامراجی ریاست کی جانب سے حمایت کا الزام ہے۔ اس تحریک میں آزادی کا نعرہ لگاتے بہت سے نوجوانوں نے پاکستان کے جھنڈے تھامے ہوئے ہیں اور مختلف درختوں اور کھمبوں پر یہ جھنڈے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن اس کی قطعاً یہ وجہ نہیں کہ یہ لوگ پاکستان کے ساتھ الحاق چاہتے ہیں بلکہ ان جھنڈوں کو بھارتی فوج سے نفرت کی علامت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ابھی تک یہ تحریک پاکستان سے مداخلت کے بغیر چل رہی ہے لیکن بھارتی ریاست اس کو مسلسل پاکستان کی شرارت قرار دے رہی ہے۔ اوڑی میں ہونے والا فوجی بیرکوں پر حملہ اس تحریک کو سبوتاژ کرنے کی ہی ایک سازش تھی۔ وہ جس نے بھی کروایا ہو اس کی شدید مذمت کرنے کی ضرورت ہے۔

پاکستان کی ریاست بھی اس تحریک سے خوفزدہ ہے اور اس کے پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں پھیلنے کے خطرے کے پیش نظر اس کو انفرادی دہشت گردی یا مذہبی جنون کے ذریعے زائل کرنا چاہتی ہے۔ 29 ستمبر کو بھارت کے پاکستان پر سرجیکل سٹرائیک کا مقصد بھی یہی تھا کہ اس تحریک کو زائل کرنے کے لیے پاک بھارت تنازعے کو بھڑکایا جائے۔ بھارت کے اس دعوے کے مطابق بھارتی فوجیوں نے پاکستانی علاقے میں گھس کر دہشت گردوں کے بیس کیمپ پر حملہ کیا جہاں وہ لائن آف کنٹرول پار کر کے بھارتی مقبوضہ کشمیر میں گھسنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ جبکہ پاکستان

نے اس دعوے کو رد کیا اور کہا کہ بھارتی فوج پاکستانی علاقے میں گھس ہی نہیں سکتی اور پاک فوج اپنے دفاع کے لیے ہر دم تیار ہے۔ لیکن ساتھ ہی جھینپتے ہوئے ایک بھارتی فوجی کو بھی میڈیا کے سامنے پیش کیا جسے اسی سرجیکل سٹرائیک کے دوران گرفتار کیا گیا تھا۔ اگر بھارتی فوجی ادھر گھسے ہی نہیں تو پھر اس فوجی کو کیسے گرفتار کیا گیا۔ اس سوال کا جواب عالمی سرمایہ داری کے ایک جریدے 'دی اکانومسٹ' کے چند صحافیوں نے تحقیق کے بعد تلاش کیا اور بتایا کہ بھارتی فوجی پاکستانی مقبوضہ علاقوں میں گھسے بھی تھے اور کچھ دہشت گردوں کو ہلاک بھی کیا تھا لیکن جتنا وہ دعویٰ کر رہے ہیں اس کی نسبت تعداد انتہائی کم ہے۔

اس سرجیکل سٹرائیک کے بعد دونوں اطراف کے میڈیا نے جنگ کا طبل بجا دیا اور ایک نئی جنگ کی کیفیت بننے لگی لیکن جلد ہی دونوں ممالک میں میڈیا کا رخ دوسرے ایشوز کی طرف کر دیا گیا اور کشمیر کی خبر سرخیوں سے اندرونی صفحات پر چلی گئی۔ اس دوران لائن آف کنٹرول پر مسلسل کشیدگی جاری ہے اور دونوں جانب فوجیوں کی ہلاکتوں کے دعوے کیے جا رہے ہیں۔ پاکستانی مقبوضہ کشمیر کی وادی نیلم پر تیرہ سال بعد شیلنگ کی گئی ہے۔ جبکہ دوسری جانب بھارتی ریاست دعویٰ کر رہی ہے کہ پاکستان بڑے پیمانے پر کشمیر میں مداخلت کے لیے دہشت گردوں کو بھیج رہا ہے۔

لیکن ہندوستان کے سنجیدہ حلقے کشمیر کی اس تحریک کو ماضی سے مختلف قرار دے رہے ہیں اور اس نپٹنے کے لیے بھی نئے حل تلاش کرنے کی ضرورت پر زور دے رہے ہیں۔ اس حوالے سے ہندوستان کے سابقہ نیشنل سکیورٹی ایڈوائزر ایم کے نارائن کا روزنامہ 'دی ہندو' کا ایک مضمون اہمیت کا حامل ہے جس میں اس تحریک کے کردار کا سنجیدہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس مضمون کا عنوان ہے، ''کشمیر کے 'نئے معمول' سے کیسے نپٹا جائے''، مضمون میں نارائن نے لکھا ہے؛

''تاریخ ان لوگوں کو معاف نہیں کرے گی جو موجودہ حقیقتوں اور ماضی کے حالات میں فرق نہیں کرتے۔۔۔

''ایسا کوئی ثبوت نہیں کہ لشکر طیبہ یا جیش محمد ان پرتشدد کاروائیوں میں شامل ہیں، گو کہ حزب المجاہدین کے کیڈر کافی تعداد میں موجود ہیں۔ لیکن ان احتجاجوں میں شامل ہونے والوں کی وسیع اکثریت مکمل طور پر ان گروپس سے 'غیر منسلک' (Unattached) ہے۔ بہت سے تعلیم یافتہ بیروزگاروں کی صفوں میں سے آئے ہیں جبکہ کچھ کی عمریں بمشکل دس یا بارہ سال ہوں گی۔۔۔

موجودہ پرتشدد کاروائیوں میں ''غیر منسلک'' جنگجوؤں کی شمولیت ایک نیا عمل ہے جو 'بیرونی' جنگجوؤں سے مختلف ہے۔''

کشمیر میں گزشتہ تین دہائیوں سے جاری تحریکوں میں دہشت گرد کاروائیاں کرنے والے جہاں پاکستان سے آتے تھے وہاں حزب المجاہدین کی شکل میں کچھ ایسے نوجوان بھی مسلح جدوجہد کی جانب راغب ہوئے جو خود کشمیر کے ہی رہنے والے تھے۔ ان نوجوانوں میں اور باہر سے آنے والوں کے طریقوں اور امنگوں میں فرق تھا۔ بھارتی حکومت نے مختلف طریقوں سے ان کشمیری نوجوانوں سے نپٹنے کی کوشش کی اور وقت کے ساتھ ان مسلح کاروائیوں میں کمی آتی گئی۔ ایک طرف افغان جہاد ختم ہوا اور وہاں سے تربیت یافتہ جہادیوں کی آمد کا سلسلہ ختم ہوا تو دوسری طرف مقامی سطح پر قیادتوں کی غداریوں کے باعث تحریک پسپائی کی جانب بڑھی۔ 2002ء کے ریاستی انتخابات کے بعد کشمیر کو پُر امن قرار دے دیا گیا اور بھارتی ریاست کشمیر کے مسئلے میں اپنی کامیابی کے گن گانے لگی۔ اس دوران حریت کانفرنس بھی سپلٹ کا شکار ہوئی اور میر واعظ عمر فاروق اور سید علی گیلانی بھی ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ یہ سپلٹ ابھی تک موجود ہے گو کہ ان میں صلح کروانے کی کوششیں جاری ہیں۔ لیکن 2008ء میں دوبارہ تحریک شروع ہوئی جبکہ 2010ء میں عمر عبداللہ کی نیشنل کانفرنس کی حکومت کے خلاف ایک بہت بڑی تحریک ابھری جس میں 119 نوجوانوں کو سکیورٹی فورسز کی جانب سے قتل کیا گیا۔ اس تحریک میں 'سنگ باز' کھل کر ابھرے اور انہوں نے بھارتی فوج پر پتھراؤ کر کے بہت سوں کو زخمی کیا۔ برہان وانی سمیت کچھ نوجوان اس تحریک کے بعد دوبارہ مسلح جدوجہد کی طرف گئے۔ ان نوجوانوں نے اپنی اصل شناخت چھپائے بغیر سوشل میڈیا اور دیگر طریقوں سے نوجوانوں کو ریکروٹ کرنا شروع کر دیا۔ لیکن دوسری جانب تحریک کے دوران کیے گئے حکومت کے تمام وعدوں اور دہلی سے آنے والے مذاکراتی وفدوں کی تمام تر یقین دہانیوں کے باوجود بیروزگاری اور معاشی مسائل میں اضافہ ہوتا رہا۔ ایسے حالات میں ایک نئی تحریک کے حالات پکتے رہے۔ اسی عرصے میں برہان وانی کافی مقبول ہوا اور حزب المجاہدین کا پوسٹر بوائے کہلانے لگا۔ اس سال آٹھ جولائی کو اس کے قتل نے اس نئی تحریک کا آغاز کر دیا۔ وانی کے جنازے پر دو لاکھ سے زیادہ افراد موجود تھے۔ اس کے بعد شہید ہونے والے نوجوانوں کے جنازوں پر بھی کرفیو کے باوجود بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ سابق وزیر اعلیٰ عمر عبداللہ نے ایک بیان میں کہا کہ، ''برہان سوشل میڈیا سے کبھی اتنی

ریکروٹمنٹ نہیں کرسکتا تھا جتنی وہ اپنی قبر کے اندر سے کر رہا ہے۔''

ایم کے نارائن اپنے مضمون میں لکھتا ہے،

''وادی میں موجودہ ہنگاموں کو ماضی کے ہنگاموں کے تسلسل کے طور پر دیکھ کر نپٹنا بیوقوفانہ ہو گا۔۔۔ابھی تک وادی میں غیر معمولی صورتحال کے باوجود کوئی ایسی معنی خیز کوشش نہیں کی گئی کہ دیکھا جائے کہ سطح سے نیچے کیا ہو رہا ہے۔ بہت کم لوگ ایسا خیال کر رہے ہیں کہ یہ تحریک کشمیر کی مشکلات سے بھرپور تاریخ میں ایک خطرناک موڑ بنے گی۔۔۔ برہان وانی کون تھا؟ حزب المجاہدین میں حال ہی میں شامل ہونے کے باوجود یہ تنظیم اسے شہید کے طور پر کیسے دیکھتی ہے؟ اور سب سے اہم یہ کہ اس کا موازنہ چے گویرا جیسے قد کی شخصیت کے ساتھ کیونکر کیا جا رہا ہے؟ کشمیر کی تاریخ میں کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ اتنے کم عرصے میں عام لوہا سونے میں تبدیل ہو گیا ہو۔''

''جدوجہد کا کردار تبدیل ہو چکا ہے اور اس کی وجوہات جاننے کے لیے بھی گہرے مشاہدے کی ضرورت ہے۔۔۔ایسا تاثر ملتا ہے کہ تحریک آٹو پائلٹ پر ہے جس کا کوئی لیڈر نہیں۔ پرانے دقیانوسی دلائل کے ذریعے کشمیر کی موجودہ بغاوت کی وضاحت کرنے کے الٹ اثرات ہو سکتے ہیں۔ برہان وانی کے قتل سے شروع ہونے والا عمل اور سکیورٹی فورسز کے مظالم سے پیدا ہونے والا غصہ اور نفرت ہمدردانہ بیانات سے ختم نہیں ہوگی۔ نہ ہی اس کا ملبہ دہلی کی جانب سے کشمیر کے مسئلے کی ناسمجھی پر ڈال دینے سے کچھ حل ہوگا۔ اس کی تمام تر ذمہ داری نوجوانوں کی نئی نسل کے سوشل میڈیا کے استعمال پر بھی بالکل نہیں ڈالنی چاہیے۔ بنیادی وجوہات کہیں زیادہ گہری ہیں۔ وانی کے جنازے پر دو لاکھ افراد کی موجودگی زیادہ تسلی بخش وضاحت طلب کرتی ہے۔''

''انسانیت، کشمیریت اور جمہوریت' کے جملے دہرانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ نہ ہی آئین کے آرٹیکل 370 کو قائم رکھنے یا سپیشل پاور ایکٹ کے خاتمے کا وعدہ اور ترقیاتی بجٹ میں اضافہ احتجاج کرنے والوں کی نئی نسل کی پذیرائی حاصل کر سکتا ہے۔۔۔حریت رہنماؤں سے مذاکرات کے نتیجے میں ایک اچھی پیش رفت ہو سکتی ہے لیکن آج کی صورتحال میں وہ غیر ضروری اور غیر متعلق ہو چکے ہیں جیسے کسی اور زمانے میں ہوں۔ وہ بغاوت میں اتری ہوئی نئی نسل سے بچھڑ چکے ہیں اور ان کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔۔۔''

''دس بارہ سال کے سکول جانے والے بچوں کیخلاف اسی قسم کی طاقت کا استعمال جو لشکر، جیش اور حزب کیخلاف کیا جاتا تھا جذبات کو مزید بھڑکائے گا۔۔۔وزیر اعلیٰ محبوبہ مفتی اور اس کے حالیہ

مشیروں کے پاس وہ ذہانت اور سیاسی فراست نہیں کہ وہ اس معاملے سے نپٹ سکیں۔ دہلی میں بھی ایسی ہی صورتحال ہے اور کشمیر میں سطح سے نیچے ہونے والی دھماکہ خیز تبدیلیوں سے نپٹنے کی صلاحیت موجود نہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ دانشوروں اور سیاسی قیادتوں کے علاوہ سماجی سائنس اور نفسیات کا علم رکھنے والوں کی بھی مدد طلب کی جائے تا کہ صورتحال سے باہر نکلنے کے لیے تازہ دم خیالات مل سکیں۔'' (دی ہندو، 11 اکتوبر 2016ء)

نارائن نے واضح کر دیا ہے کہ صورتحال ماضی کی نسبت بہت زیادہ مختلف ہے اور کسی کے پاس بھی اس صورتحال سے نپٹنے کی صلاحیت نہیں۔ تمام سنجیدہ تجزیہ نگار ایسے ہی نتائج اخذ کر رہے ہیں۔ رائزنگ کشمیر کے ایڈیٹر شجاعت بخاری نے کہا کہ ''لوگوں کا سیاسی جدوجہد سے ایمان اٹھ گیا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ کشمیر میں ہر کوئی مسلح جدوجہد کر رہا ہے۔ لیکن ہر کوئی اس سے ہمدردی ضرور رکھتا ہے۔ اور یہ ایک نئی حقیقت ہے۔''

درحقیقت یہ سیاسی قوتوں کی ناکامی کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ گزشتہ تین دہائیوں میں ہزاروں مذاکرات، درجنوں انتخابات اور دیگر کوششوں کے باوجود کوئی بھی سیاسی پارٹی ان مسائل کا حل نہیں دے سکی اور اب یہ تحریک معیاری حوالے سے ایک جست لگا چکی ہے اور اس کے جلد ختم ہونے کے امکانات دکھائی نہیں دیتے۔ اگر کسی طرح یہ ماند بھی پڑ گئی تو زیادہ شدت کے ساتھ بہت جلد دوبارہ ابھرے گی۔

اسی دوران پاکستانی ریاست اپنے مقبوضہ کشمیر میں اس تحریک کے پھیلنے سے خوفزدہ ہے۔ پہلے ہی گلگت بلتستان میں ایک تحریک موجود ہے جبکہ سرحد کے دوسری جانب کارگل میں بھی کشمیر کی تحریک کے شعلے پہنچ رہے ہیں۔ کشمیر کی تحریک اب صرف وادی تک محدود نہیں بلکہ جموں کی وادی چناب میں بھی داخل ہو چکی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ پھیلتی جا رہی ہے۔ ایسے میں پاکستانی مقبوضہ کشمیر کے نوجوان اگر اس تحریک کے ساتھ اظہار یکجہتی میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو دونوں ہمسایہ سامراجی ممالک کے لیے مشکلات پیدا ہوں گی۔ پہلے ہی لائن آف کنٹرول پر مسلسل کشیدگی موجود ہے اور آنے والے دنوں میں اس میں شدت آ سکتی ہے۔ تحریک کو مکمل طور پر زائل کرنے کے لیے دونوں ممالک ایک چھوٹی اور محدود جنگ کی جانب بڑھ سکتے ہیں گو کہ یہ خود ان دونوں ریاستوں کو درپیش مسائل کو مزید گہرا کرے گی۔

ہندوستان میں یہ تحریک اس وقت ابھری ہے جب یہاں کے محنت کش طبقے نے تاریخ کی

سب سے بڑی عام ہڑتال کی ہے جس میں اٹھارہ کروڑ افراد نے شرکت کی۔ پورے ہندوستان میں قوم، نسل، رنگ، مذہب اور زبان کی بنیاد پر موجود تعصّبات کو چیر کر اس ہڑتال نے طبقاتی بنیادوں پر محنت کشوں کو اکٹھا کیا ہے جو ایک اہم پیش رفت ہے۔ اس ہڑتال نے ہندوستان کی ریاست کو بوکھلا دیا ہے اور وہ اس بوکھلاہٹ میں کوئی بھی بڑا قدم اٹھا سکتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود صورتحال پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ کشمیر میں نوے کی دہائی میں چلنے والی تحریک کے وقت سوویت یونین کا انہدام ہو رہا تھا اور پوری دنیا پر امریکی سامراج کا غلبہ بڑھ رہا تھا۔ ایسے میں ہندوستان سمیت ہر جگہ بائیں بازو کی قوتیں پسپائی کا شکار تھیں۔ لیکن آج نہ صرف سٹالنزم کے نظریات کی حقیقت عیاں ہو چکی ہے بلکہ ہر جانب تحریکیں ابھر رہی ہیں جو سرمایہ دارانہ نظام کو چیلنج کر رہی ہیں۔ ایسے میں کشمیر کے نوجوانوں کے پاس اہم اسباق حاصل کرنے کے مواقع ہیں۔ وہ عرب انقلابات سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اس کے علاوہ یورپ میں جاری مختلف تحریکوں کے نتائج سے راہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ خود ہندوستان میں طلبہ کی ایک تحریک موجود ہے جس نے کشمیر کی قومی آزادی کی حمایت کی ہے۔ ایسے میں کشمیر کی تحریک پورے برصغیر کے لیے وہ چنگاری بن سکتی ہے جو یہاں کی بے چینی اور عدم استحکام کو بھڑکا دے۔ عرب انقلاب کا آغاز بھی تیونس کے ایک گاؤں سے ہوا تھا جس نے پوری دنیا کو لرزا دیا۔ لیکن دونوں جانب کے حکمران طبقات اور مغربی سامراجی قوتیں ہر ممکن طریقے سے اس تحریک کو کچلنے کی کوشش کریں گی۔ پاکستان کے حکمران فروعی ایشوز کو ابھار کر ان تحریکوں کو زائل کرنے کی کوشش کریں گے اور ان کے لیے سب سے کارآمد ہتھیار دہشت گرد تنظیمیں ہیں جنہیں وہ اپنے ملک میں بھی عوامی تحریکوں کو زائل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن واضح ہو چکا ہے کہ پرانے روایتی ہتھکنڈے اب وہ اثرات مرتب نہیں کر سکیں گے جو ماضی میں کرتے رہے ہیں۔ حریت کانفرنس کے راہنماؤں کی گرفتاری، نظر بندی اور ان پر ہونے والے تشدد کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ کسی طرح انہیں تحریک کی قیادت کے طور پر تسلیم کروایا جائے لیکن زمینی حقائق کچھ اور بتاتے ہیں۔

نارائن نے بھی اس تحریک کا گہرائی میں تجزیہ کرنے کے بعد حل پیش کرنے سے معذرت کر لی ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ سماجی سائنس کا علم رکھنے والوں سے رجوع کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ داری خود ایک بند گلی میں داخل ہو چکی ہے جہاں اس کے پاس کسی مسئلے کا کوئی حل نہیں۔ کوئی بھی پارٹی اس نظام میں رہتے ہوئے کشمیر کے 40 لاکھ سے زائد بیروزگار نوجوانوں کو روزگار فراہم

نہیں کرسکتی اور نہ ہی انہیں کسی بھی قسم کے بہتر مستقبل کی یقین دہانی کرا سکتی ہے۔ کمیونسٹ پارٹیوں سے لے کر بی جے پی تک سب اسی نظام میں رہ کر حل تلاش کر رہی ہیں جو موجود نہیں۔ اس وقت دنیا کی جدید ترین سماجی سائنس مارکسزم ہے اور وہی ان مسائل کا حل فراہم کرتا ہے۔ اس کے مطابق اس پورے نظام کو اکھاڑ پھینکنا ہوگا تب ہی امن اور خوشحالی آسکتی ہے۔

نئی نسل

اس وقت پاکستان سمیت پورے خطے بلکہ پوری دنیا میں ایک عمل واضح ہے کہ عوام کی بہت بڑی اکثریت کا مروجہ سیاسی عمل سے اعتماد اٹھ چکا ہے۔ پاکستان میں ایک نئی نسل جوان ہو چکی ہے جس نے جب سے شعور کی آنکھ کھولی ہے اس نے انہی بدعنوان سیاستدانوں اور فوجی جرنیلوں کو ہی دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ ایک لمبے عرصے سے سیاستدانوں کے تمام تر دعووں کے برعکس حالات خراب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ تعلیمی اداروں کے طلبہ ہوں یا فیکٹریوں میں کام کرنے والے محنت کش اس نوجوان نسل کو مستقبل میں کوئی روشنی نظر نہیں آ رہی۔ ان کی ایک بہت بڑی اکثریت کسی سیاسی پارٹی اور قیادت پر اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام کا تمام سیاسی ڈھانچہ ایک دیمک زدہ کھوکھلی عمارت بن کر رہ گیا ہے جو دیکھنے میں بہت طاقتور اور مضبوط نظر آتی ہے لیکن ایک ٹھوکر سے پوری عمارت دھڑام سے گر جاتی ہے۔ امریکہ سمیت بہت سے ملکوں میں یہ صورتحال نظر آتی ہے۔ مسئلہ یہ نہیں کہ ایک پارٹی کے ساتھ کتنے لوگ وابستہ ہیں اور دوسری پارٹی کے ساتھ کتنے بلکہ جو مکمل سیاسی نظام ہے اس پر لوگوں کا اعتماد ہے یا نہیں اور کیا وہ اسے قبول کرنے کے لیے تیار ہیں یا نہیں۔ اس سیاسی نظام پر اعتماد کیسے بحال کروایا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے سیاسی پارٹیوں کو عوام کے مسائل حل کرنے ہوں گے لیکن کسی بھی سیاسی پارٹی کے برسر اقتدار آنے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ بلکہ کوئی بھی سیاسی پارٹی آ جائے مسائل کی شدت میں اضافہ ہی ہوتا ہے اور عوام بار بار اس تجربے سے گزر رہے ہیں۔ پاکستان میں اس وقت تقریباً تمام پارٹیاں برسر اقتدار ہیں جبکہ فوج بھی پس پردہ اقتدار میں حصے دار ہے۔ پختونخواہ میں تحریک انصاف اور جماعت اسلامی کی مخلوط حکومت ہے جبکہ بلوچستان میں نون لیگ اور بلوچ و پشتون قوم پرستوں کی مخلوط حکومت ہے، سندھ میں پیپلز پارٹی برسر اقتدار ہے جبکہ ایم کیو ایم کا گورنر اور کراچی کا میئر موجود ہے۔ پنجاب اور مرکز میں ن لیگ اور فضل الرحمان برسر اقتدار ہیں۔ لیکن ہر جگہ ایک ہی

پالیسی جاری ہے اور کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہو پا رہا۔ اس حوالے سے یہ سیاسی پارٹیاں کسی حل کا حصہ بننے کی بجائے مسئلے کا حصہ بن چکی ہیں۔

کشمیر میں جس بنیادی تبدیلی کا ذکر ایم کے نارائن نے کیا ہے وہ محض کوئی ایک مظہر نہیں بلکہ ایک پیچیدہ عمل ہے جو ہر جگہ مختلف شدت اور نوعیت سے جاری ہے کشمیر میں صرف اس کا کھل کر اظہار ہوا ہے۔ سماجی برداشت اور سیاسی درجہ حرارت کا آپس میں تعلق کسی ایک کلیے کی شکل میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہ بنیادی سماجی تبدیلی ہے جس نے تمام پرانے سیاسی و ریاستی ڈھانچے کو سماج سے لاتعلق کر دیا ہے۔ پاکستان اور ہندوستان سمیت بہت سی جگہوں پر موجود تمام سیاسی پارٹیاں کسی اور زمانے کی سیاست کر رہی ہیں جبکہ سماج کسی دوسرے زمانے میں پہنچ چکا ہے۔ ایسے میں لاکھ کوششوں کے باوجود ان کا آپس میں تعلق نہیں بنایا جا سکتا۔

تحریک انصاف مسلسل کوشش کر رہی ہے کہ نواز شریف کی بدعنوانی کیخلاف عوام کو اکٹھا کیا جائے۔ اس کے لیے ریاست کے مختلف دھڑے بھی اس کی کھل کر حمایت کر رہے ہیں، میڈیا میں بھی ہر وقت چیخ و پکار موجود ہے جبکہ کروڑوں روپے بھی خرچ کیے جا رہے ہیں اور لنگر کی دعوت عام ہے۔ دونو مبر والے ڈرامے میں پولیس کے نام نہاد تشدد اور شیخ رشید کی پھرتیوں سے سنسنی اور ایکشن کا مصالحہ بھی ڈالا گیا۔ پرویز رشید کے استعفیٰ نے تو تحریک انصاف کے پلڑے کو وزنی کر کے سنسنی میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود دونو مبر کو اسلام آباد کو بند کرنے کا جو واویلا کیا گیا اس کے لیے چند ہزار سے زیادہ افراد شرکت کے لیے نہیں نکل سکے۔ اس میں بھی بڑی تعداد پختونخواہ سے تھی جہاں ان کی حکومت ہے۔ اور بالآخر اتنے شور شرابے کے بعد اسے کینسل کر دیا گیا۔ تحریک انصاف کے کارکن اس کا نتیجہ یہ اخذ کرتے ہیں کہ عوام بے حس ہو چکے ہیں۔ جبکہ ایسا بالکل نہیں۔ عوام اپنی زندگی اور حالات سے جتنے آج تنگ ہیں شاید کبھی بھی نہیں تھے اور نواز شریف کے مظالم اور بڑھتی ہوئی مہنگائی کیخلاف احتجاج کرنا بھی چاہتے ہیں لیکن وہ ان سیاسی پارٹیوں اور ان کی قیادتوں پر کسی طور پر بھی اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں جو نواز شریف کی پارٹی جیسی ہی ہیں۔ اس کے لیے یقیناً صرف ایسی سیاسی پارٹیوں اور تنظیموں کی ضرورت ہے جو نئے حالات سے ہم آہنگ ہو کر عوام کی امنگوں اور خواہشات کے مطابق پیغام دے۔ جو اس سرمایہ دارانہ نظام کو اکھاڑنے کے سوا کچھ نہیں۔

مزدور تحریک

تحریک انصاف کی اس جعلی تحریک کے علاوہ پورے ملک میں محنت کشوں کی سینکڑوں بکھری ہوئی تحریکیں موجود ہیں لیکن نہ تو کوئی سیاسی پارٹی ان کی حمایت کر رہی ہے اور نہ ہی یہ تحریکیں کسی سیاسی پارٹی پر اعتماد کرنے کے لیے تیار ہیں۔ یہ اس سماج کی ایک نئی کیفیت کی غمازی کرتا ہے جس میں جاری چھوٹی بڑی تمام تحریکیں مروجہ سیاست سے مکمل طور پر بیگانہ ہو چکی ہیں اور اس سے الگ تھلگ موجود ہیں۔ جس وقت تحریک انصاف، جو اس وقت سب سے مضبوط اپوزیشن ہے، اپنے چند سو کارکنوں کے ساتھ کسی جگہ پر حکومت کے خلاف شدید ترین احتجاج اور جلاؤ گھیراؤ کر رہی ہوتی ہے اسی وقت اسی سڑک پر یا اس کے قریب محنت کش روزگار کی مستقلی کے لیے، نجکاری کیخلاف اپنے کسی مسئلے کے لیے احتجاج کر رہے ہوتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے ہاتھ ملانا بھی پسند نہیں کرتے۔ یہی حال باقی تمام پارٹیوں کا ہے۔ پیپلز پارٹی کی قیادت کسی عالیشان پریس کلب میں حکومت کیخلاف انتہائی اہم پریس کانفرنس کر رہی ہوتی ہے اور قیادت کی جانب سے حکومت کو سخت نتائج کی وارننگ دی جا رہی ہوتی ہے جبکہ پریس کلب کے باہر محنت کش نجکاری یا مزدور دشمن کاروائیوں کیخلاف احتجاج کر رہے ہوتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے لاتعلق ہیں۔

اس وقت اساتذہ، ینگ ڈاکٹروں، نرسوں، واپڈا، پی آئی اے، ریلوے، اسٹیل مل اور سوئی گیس سمیت درجنوں اداروں میں تحریکیں موجود ہیں اور ان کے مسلسل احتجاج اور ہڑتالیں جاری ہیں لیکن یہ تمام تحریکیں کسی بھی سیاسی پارٹی سے وابستہ نہیں ہیں۔ اس سے نظر آتا ہے کہ پاکستان میں ایک نہیں دو قسم کی تحریکیں ہیں۔ ایک وہ تحریکیں ہیں جو حکمران طبقے کے مختلف دھڑوں کی لڑائی کا شاخسانہ ہیں جن کا اظہار سیاسی پارٹیوں کی لڑائیوں میں ہوتا ہے۔ میڈیا ان تحریکوں کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے اور ان پر گھنٹوں تبصرے کیے جاتے ہیں اور اخباروں کی سیاہی ضائع کی جاتی ہے۔ ان تمام تر تحریکوں اور ایشوز کا عوام کے کسی بھی مسئلے سے کوئی تعلق نہیں۔ ان لڑائیوں کو کبھی سپریم کورٹ، کبھی فوج اور کبھی پارلیمنٹ کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن کسی ایشو کا کبھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا خواہ وہ این آر او ہو یا پانامالیکس۔ لیکن دوسری جانب ایسی تحریکیں نظر آتی ہیں جو روزگار کی فراہمی یا مستقلی، اجرتوں میں اضافے، نجکاری، ڈاؤن سائزنگ، لوڈ شیڈنگ، کھاد کی قیمتوں میں کمی یا دیگر اہم اور بنیادی ایشوز پر جاری ہیں اور جن میں محنت کشوں کی ایک خاطر خواہ تعداد شریک ہوتی ہے۔ ان تحریکوں کو میڈیا پر بہت کم دکھایا جاتا ہے یا اکثر اوقات

دکھایا ہی نہیں جاتا۔ان پر کوئی تبصرہ نہیں ہوتا اور نہ کالم لکھا جاتا ہے۔اور سب سے بڑھ کر کوئی بھی سیاسی پارٹی ان کی حمایت کرنے یا ان مطالبات کو لے کر جدوجہد کرنے کی جانب نہیں بڑھتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی سیاسی پارٹی کے پروگرام میں ان مسائل کا حل موجود نہیں اور وہ صرف لوٹ مار کے پروگرام پر کاربند ہیں۔وقت کے ساتھ ساتھ نظر آتا ہے کہ سیاسی پارٹی کے فروعی ایشوز کی لڑائیوں میں لوگوں کی شرکت کم ہوتی چلی جارہی ہے جبکہ حقیقی ایشوز پر چلنے والی تحریکوں میں اضافہ بھی ہورہا ہے اور ان میں شرکت بھی بڑھ رہی ہے۔یہ مقداری اضافے کسی خاص نکتے پر پہنچ کر معیاری جست کے ضرور متقاضی ہوں گے۔اگرچہ یہ مقداری اضافے بتدریج نہیں ہونگے بلکہ ان میں اتار چڑھاؤ آتے رہیں گے مگر بحیثیتِ مجموعی آنے والے دنوں میں معاشی بحران کے پیش نظر ان میں مزید شدت آئے گی۔بہت سی جگہوں پر یہ تحریکیں ایک دوسرے کے بالمقابل بھی آتی ہیں جیسا کہ دہشت گردی کا ایشو ہے۔ان واقعات پر ریاست کے مختلف دھڑے اپنی پروردہ سیاسی پارٹیوں کے ذریعے اس ایشو پر اپنے ایجنڈے کی تکمیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن دوسری جانب ان واقعات پر شدید عوامی ردعمل موجود ہوتا ہے جسے کوئی بھی پارٹی جگہ دینے سے قاصر ہے بلکہ ریاست اور پارٹیاں اس سے خوفزدہ ہوجاتی ہیں۔

سیاسی پارٹیوں کے ساتھ ساتھ ٹریڈ یونین کے بحیثیت ایک ادارے کے زوال کے باعث محنت کشوں کے پاس کوئی ایسی جگہ نہیں رہ گئی جہاں وہ اپنے غم و غصے کا اظہار کرسکیں۔گزشتہ تین دہائیوں سے جاری نجکاری کے تابڑ توڑ حملوں نے مزدور یونینوں کو کمزور کر کے ختم کیا ہے۔اب واپڈا اور پی آئی اے کی نجکاری کے ذریعے رہی سہی کسر بھی پوری کی جارہی ہے۔اس سارے عمل میں جہاں ریاست اور سرمایہ داروں نے مزدوروں کی یونین سازی پر بدترین حملے کیے وہاں سوویت یونین کے انہدام کے بعد مزدور تحریک میں سے نظریاتی سیاست کا بھی خاتمہ ہوگیا جس کے بعد ٹریڈ یونین لیڈروں کے لیے بکنا اور غداری کرنا آسان ہوگیا۔سیاست کے عمومی زوال نے اس زوال کو مزید شدت عطا کی۔ان سارے حملوں سے ٹھیکیداری نظام، اوقات کار میں اضافہ اور حقیقی اجرتوں میں بڑے پیمانے پر کمی دیکھنے میں آئی۔ایک اندازے کے مطابق اگر کم از کم اجرت کا موازنہ سونے کی قیمت سے کیا جائے تو گزشتہ دو دہائیوں میں اجرتیں کم ہوکر تقریباً نصف ہوچکی ہیں۔یعنی کرنسی کی قدر کے تناسب سے دیکھا جائے تو دو دہائیاں پہلے بیس ہزار روپے ماہانہ اجرت لینے والا مزدور آج دس ہزار روپے اجرت لے رہا ہے۔جبکہ اس دوران مہنگائی اور اشیائے

ضرورت کی قیمتوں میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ صرف اسی ایک عدد سے نظر آتا ہے کہ مزدوروں کے معیار زندگی میں کتنی گراوٹ آئی ہے۔ لیکن اس سارے عرصے کے دوران مزاحمت جاری رہی ہے لیکن مضبوط نظریاتی بنیادیں نہ ہونے کے باعث بہت کم تحریکیں کامیابی سے ہمکنار ہوئی ہیں۔ لیکن ان تمام تر تجربات سے مزدور تحریک نے اہم نتائج بھی اخذ کیے ہیں۔ اس میں سب سے اہم سبق غدار ٹریڈ یونین قیادتوں سے چھٹکارا ہے جو ایک لمبے عرصے سے مزدور تحریک کے کندھوں پر بوجھ بن چکے تھے۔ اس کے علاوہ اس دوران محنت کشوں کی ایک نئی نسل بھی پروان چڑھی ہے جس نے نوے کے بعد کی مزدور تحریک کی پسپائی اور غداری کے زخم نہیں جھیلے۔ وہ تازہ دم ہے اور اپنے حقوق کے لیے ہر حد تک جانے کے لیے تیار ہے۔ ان کے سامنے رکاوٹیں کھڑی کرنے والے مزدور لیڈروں کو بھی انہوں نے رد کیا ہے۔

اس کی سب سے بڑی مثال اس سال فروری میں ہونے والی پی آئی اے کے محنت کشوں کی ہڑتال تھی۔ اس ہڑتال کا انجام خوشگوار نہیں تھا لیکن جیسے اس کا آغاز ہوا اور جس جرات اور دلیری سے یہ آگے بڑھی اس نے پاکستان کی مزدور تحریک میں ایک روشن باب رقم کیا۔ دو فروری کو ہونے والی اس ہڑتال سے قبل کئی ہفتوں سے ملازمین کے احتجاجی مظاہرے جاری تھے اور حکومت سے نجکاری کا فیصلہ واپس لینے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ حکومت نے مظاہروں کو ختم کروانے کے لیے مطالبات کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا اور کہا کہ پی آئی اے کی نجکاری چند ماہ کے لیے مؤخر کر دی جائے گی۔ لیکن اس کے باوجود ملازمین نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کیا اور کہا کہ حکومت نجکاری ملتوی کرنے کی بجائے اس پالیسی کے مکمل خاتمے کا اعلان کرے ورنہ ہم ہڑتال کریں گے۔ حکومت نے جب یہ مطالبہ ماننے سے انکار کیا تو دو فروری کی صبح سے ہڑتال کے آغاز کا اعلان کر دیا گیا۔ حکومتی اہلکاروں نے اس اعلان کے باوجود مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

دو فروری کی صبح بھی معمول کی پروازیں چلتی رہیں اور پی آئی اے کے یونین لیڈر حکومت سے مذاکرات میں مصروف رہے۔ اس دوران کراچی ائیر پورٹ کے قریب ملازمین اکٹھا ہونا شروع ہو گئے جبکہ پروازوں کا سلسلہ معمول کے مطابق جاری رہا۔ جب لوگوں نے یونین لیڈروں سے پوچھا کہ ہڑتال شروع کیوں نہیں ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ ابھی تک مذاکرات جاری ہیں۔ لاہور ائیر پورٹ پر ملازمین کو یونین قیادت کی جانب سے اکٹھے ہونے سے منع کر دیا گیا۔ اس دوران ہر ائیر پورٹ کے باہر پولیس اور رینجرز کی بھاری نفری جمع ہونی شروع ہو گئی جن کے پاس آنسو گیس

سے لے کر واٹر کینن تک تمام تیاری موجود تھی۔ دوپہر کے قریب کراچی ائیر پورٹ پر محنت کشوں نے ائیر پورٹ کی جانب بڑھنا شروع کیا جس کے جواب میں گولی چلا دی گئی جس سے دو ملازم شہید جبکہ درجنوں زخمی ہوئے۔ مختلف میڈیا رپورٹس کے مطابق یہ گولی رینجرز کی جانب سے چلائی گئی۔ اس کے بعد پی آئی اے کے تمام ملازمین نے کام کرنا چھوڑ دیا اور پروازیں معطل ہونا شروع ہوگئیں۔ اگلے دن تک تمام اندرون ملک اور بیرون ملک پروازیں بند ہو چکی تھیں۔ اس ہڑتال میں پائلٹ سے لے کر ائیر ہوسٹس تک تمام ملازمین شامل تھے۔ حکومت اس اقدام سے بوکھلا گئی اور ہر ممکن طریقے سے ہڑتال کو توڑنے کی کوشش کی۔ جب جبر کے طریقے محنت کشوں کو نہ دبا سکے تو حکومت نے گڑگڑانا شروع کر دیا۔ شروع میں ہڑتالی ملازمین کیخلاف سخت اقدامات اور نوکریوں سے برطرفیوں کی دھمکیاں دی گئیں لیکن جب ہڑتال نہ توڑ سکے تو جھوٹے وعدے شروع کر دیے۔ اس دوران گرفتار یونین قیادت کو بھی رہا کر دیا گیا جن کے ذریعے مذاکرات کو آگے بڑھایا گیا اور دس فروری کو یہ شاندار ہڑتال حکمرانوں کے جھوٹے وعدوں کی بھینٹ چڑھا دی گئی۔

یہ آٹھ دن پاکستان کی محنت کش طبقے کی تاریخ میں سنہری الفاظ سے لکھے جائیں گے۔ اس دوران ملازمین کو پولیس اور خفیہ ایجنسیوں کے ذریعے ہراساں کیا گیا۔ انہیں کام پر واپس آنے کے لیے ہر قسم کے لالچ دیے گئے لیکن اس کے باوجود ہڑتال کو توڑا نہیں جا سکا۔ پی آئی اے کا نظام مکمل طور مفلوج ہو گیا اور خود محنت کشوں کو احساس ہوا کہ اس ادارے کو بڑی بڑی تنخواہیں لینے والے بیوروکریٹ نہیں بلکہ وہ چلاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ن لیگ کی حمایت یافتہ یونین ائیر لیگ کے ممبران نے نواز شریف کے لگے ہوئے پوسٹر پھاڑ کر جلا دیے اور نجکاری کیخلاف واشگاف نعرے لگائے۔ اس دوران کراچی ائرپورٹ پر مختلف مزدور یونینوں کے نمائندے بھی اظہار یکجہتی کے لیے آئے لیکن کسی نے اس ہڑتال کی حمایت میں اپنے ادارے میں احتجاج یا ہڑتال کا اعلان نہیں کیا۔ ریلوے اور کچھ دوسرے اداروں میں خود رو طریقوں سے احتجاج ہوئے لیکن انہیں منظّم کر کے پھیلایا نہیں جا سکا۔ انہی دنوں پاکستان کی سب سے بڑی یونین واپڈا ہائیڈرو بھی نجکاری کے مسئلے کیخلاف احتجاج کر رہی تھی لیکن اس کی قیادت نے پی آئی اے کے ہڑتالی کارکنوں کے ساتھ مل کر ہڑتال یا احتجاجی تحریک چلانے کا اعلان نہیں کیا۔ یہی کچھ اسٹیل مل اور دیگر اداروں کی مزدور قیادتوں کی طرف سے نظر آیا۔ ایم کیو ایم سمیت بہت سی پارٹیوں نے اس ہڑتال پر اپنا اثر جمانے کی کوشش کی لیکن محنت کشوں نے تمام پارٹیوں کو رد کر دیا اور دیگر مزدوروں سے یکجہتی کی اپیل کی۔

یہ ہڑتال ان نام نہاد دانشوروں کے منہ پر بھی طمانچہ ہے جو محنت کش طبقے کی تحریکوں کو ماضی کا قصہ بیان کرتے ہیں اور پی آئی اے کے ملازمین کو محنت کش کی تعریف میں گننا ہی مناسب نہیں سمجھتے۔ اس ہڑتال نے دکھایا کہ کس طرح صرف چودہ ہزار افراد اگر کلیدی ادارے میں منظّم ہو کر کاروائی کریں تو پوری ریاست کو مفلوج کرنے کی جانب بڑھ سکتے ہیں۔ سٹریٹجک نوعیت کے اس ادارے میں اتنی کامیاب ہڑتال یہاں پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی۔ اسی طرح نجکاری کیخلاف تحریک میں ملازمین پر گولی چلنے کا بھی یہ ایک انوکھا واقعہ تھا۔

آج اس ہڑتال اور مزدوروں کی دوسری تحریکوں کا گہرائی میں تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک سوال ابھرتا ہے کہ کیا یہاں ہندوستان کی طرح کوئی عام ہڑتال ہوسکتی ہے؟ بظاہر ایسا ہوتا دکھائی نہیں دیتا کیونکہ یہاں مزدور تنظیموں کو جس طرح برباد کیا گیا ہے اس کے بعد ایسا کوئی پلیٹ فارم نہیں جس کے ذریعے فوری طور پر کوئی ایسا اقدام کیا جاسکے۔ لیکن ان تنظیموں کا خلا بھی وقت اور حالات نے پر کرنا ہے۔ اور یہی تحریکیں وقت کے ساتھ وسعت اختیار کرتے ہوئے نئی مزدور تنظیموں کی بنیاد رکھیں گی۔ اس وقت سب سے بڑھ کر ضرورت ہے کہ مزدور تحریک کو دوبارہ درست نظریاتی بنیادوں پر منظّم کیا جائے۔ اس وقت ملک میں کوئی ایسا صنعتی یا سرکاری ادارہ نہیں جہاں محنت کش احتجاج کرنے یا تحریک چلانے پر آمادہ نہ ہوں۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں جہاں کے محنت کشوں کو نسبتاً آسودہ حال تصور کیا جاتا تھا وہ بھی شدید مشکلات کا شکار ہیں۔ مزدور تحریک کی پسپائی کو سرمایہ داروں نے یہاں محنت کشوں کے بدترین استحصال کے لیے استعمال کیا ہے اور ان کے اوقات کار میں اضافہ کر کے اور اجرتوں میں کٹوتیاں کر کے اپنے منافعوں میں بہت بڑا اضافہ کیا ہے۔ لیکن کوئی بھی سیاسی پارٹی یا مزدور تنظیم ان محنت کشوں کی حمایت کرنے کے لیے تیار نہیں اور انہیں خاموشی سے یہ جبر تسلیم کرنے کا مشورہ دیتی ہے۔ لیکن حالات بہتر ہونے کی بجائے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ بلدیہ ٹاؤن کراچی میں چار سال قبل ہونے والا واقعہ ایک مثال ہے جس میں تین سو کے قریب مزدور جل کے خاکستر ہو گئے تھے۔ ایسے واقعات چھوٹے پیمانے پر تقریباً ہر روز ہو رہے ہیں جہاں بوائلر پھٹنے سے دس بیس افراد ہلاک ہو جاتے ہیں لیکن ان کی ایک سطر کی خبر بھی نہیں آتی۔ گزشتہ سال لاہور سندر انڈسٹریل اسٹیٹ میں فیکٹری کی چھت گرنے سے سینکڑوں مزدور ملبے تلے دفن ہو گئے۔ یکم نومبر کو گڈانی شپ بریکنگ میں ہونے والا واقعہ بھی انہی مزدور دشمن پالیسیوں کا آئینہ دار ہے جہاں کام کے دوران تیل کے ٹینکر میں آگ لگنے سے سینکڑوں محنت کش

جل کر ہلاک ہو گئے جبکہ سینکڑوں ہی زخمی ہوئے۔ یہ صورتحال پاکستان میں محنت کش طبقے کی ایک نئی تحریک کو پکار رہی ہے جو جلد وسیع پیمانوں پر اپنا اظہار کرے گی۔ اس تحریک میں ماضی سے وابستہ تمام غدار قیادتوں کا صفایا کر کے نئی تازہ دم قیادت سامنے آئے گی جو مزدور تحریک کو سرمایہ داری کی دلدل سے نکال کر ایک سرخ سویرے کی جانب لے جائے گی۔

کسان اور سماج کی دیگر پرتیں

مزدوروں کے علاوہ کسانوں کے احتجاج بھی جاری ہیں۔ پاکستان کسان اتحاد کے نام سے کھاد اور بجلی کی قیمتوں میں کمی اور دیگر مسائل کے لیے بڑے پیمانے پر احتجاجوں کا سلسلہ جاری ہے۔ عالمی مالیاتی اداروں کی پالیسیوں کے باعث زراعت بڑے پیمانے پر تباہ ہوئی ہے۔ پچھلے مالی سال میں زرعی شعبے کی گروتھ منفی میں چلی گئی تھی۔ اس سے نظر آتا ہے کہ کسانوں پر کیا بیت رہی ہے۔ کسانوں کے ان مظاہروں میں نسبتاً متمول کسان موجود ہیں جو چھوٹے یا درمیانے درجے کے زمیندار ہیں۔ اسی لیے ان کی تحریکوں میں کسی حد تک پسماندہ خیالات بھی حاوی نظر آتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ بحران اتنا شدید ہو گیا ہے کہ درمیانے طبقے کے افراد کو بھی سڑکوں پر آنا پڑ رہا ہے۔ کسانوں کے علاوہ اوکاڑہ کے مزارعین فوج کے زمینوں پر قبضے کے خلاف مسلسل برسرپیکار ہیں۔

ڈاکٹر، وکیل، اساتذہ اور زمیندار سفید پوش درمیانے طبقے کے وہ افراد تھے جنہیں سماج میں ''معزز'' گردانا جاتا تھا۔ درمیانے طبقے کے بہت سے افراد کی تو خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے ڈاکٹر یا انجینئر بنیں۔ لیکن آج وہ ڈاکٹر سڑکوں پر پولیس کے ڈنڈے کھا رہے ہیں۔ معیشت کا بحران درمیانے طبقے کو تیزی سے نیچے کی جانب دھکیل رہا ہے۔ یہاں تک کہ چھوٹے صنعتکار بھی بجلی اور گیس کی لوڈ شیڈنگ کیخلاف احتجاج کرنے پر مجبور ہو چکے ہیں۔ ایسے میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ محنت کش طبقے کے افراد کی کیا حالت ہے اور وہ اس نظام سے کتنے تنگ ہیں۔ دیہاتوں میں رہنے والے کھیت مزدوروں اور سماج کی غریب ترین پرتوں کے افراد کے احتجاج تقریباً ہر روز اس ملک میں کہیں نہ کہیں جاری رہتے ہیں۔ کچھ احتجاجوں میں ہزاروں کی تعداد میں افراد عورتوں اور بچوں کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔ کہیں کوئی کسی بڑے زمیندار کے ظلم کے خلاف سڑک بلاک کر دیتے ہیں اور کہیں پولیس کی بدمعاشی کیخلاف تھانے پر حملہ کر دیتے ہیں۔ لوڈ

شیڈنگ اور ناجائز بلوں کے خلاف احتجاج تو معمول بن چکے ہیں۔لیکن ان کی خبریں میڈیا پر دیکھنے میں نہیں آتیں۔خود صحافیوں کی اکثریت ہر جگہ ظالم مافیا کا حصہ بن چکی ہے اوران مظالم میں شریک ہوتی ہے۔صرف وہ خبریں منظر عام پر آتی ہیں جن میں مافیا کے افراد کی آپس میں پھوٹ پڑ جائے۔اس کے بعد بھی عدالتی کاروائیوں کے ذریعے ان تحریکوں کو زائل کیا جاتا ہے یا پھر سیاسی پارٹیوں کی رسہ گیر اور جرائم پیشہ قیادتیں انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہیں۔لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ایسے احتجاجوں کا سلسلہ وسعت اختیار کر رہا ہے اور آنے والے بحرانوں میں زیادہ شدت اختیار کرے گا۔اگر کوئی انقلابی تحریک ابھرتی ہے تو وہ ان تمام احتجاجوں اور تحریکوں کو یکجا کرنے کی جانب بڑھے گی اوران ظالم حکمرانوں کیخلاف اتنی بڑی تعداد میں محنت کشوں کو اکٹھا کرے گی کہ یہ اس کا حجم دیکھ کر ہی کانپ جائیں گے۔

طلبا سیاست اور نوجوانوں کا کردار

پاکستان میں طلبا تحریک کی شاندار روایت رہی ہے لیکن ضیاالباطل کے دور میں طلبا یونینوں پر نہ صرف پابندی لگائی گئی بلکہ انہیں ایک منظّم انداز میں غنڈہ گردی اور بھتہ خوری کی جانب موڑا گیا۔ نظریاتی زوال پذیری نے اس عمل کو زیادہ تیز کر دیا۔لیکن آج کا طالبعلم ایک مختلف کیفیت میں ہے۔اس نے نہ تو طلبا تحریک کا وہ شاندار ماضی دیکھا ہے اور نہ طلبا یونین میں غنڈہ گردی کو سرایت ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔اس نے تعلیمی اداروں کی انتظامیہ کی بدمعاشی دیکھی ہے، فیسوں میں اضافہ دیکھا ہے اور اپنے سامنے بیروزگاری کا مستقبل دیکھ رہا ہے۔اس کے پاس بھی احتجاج کے سوا کوئی راستہ نہیں لیکن المیہ یہی ہے کہ اس کے پاس کوئی بھی ایسا پلیٹ فارم نہیں جہاں سے وہ اپنے مسائل کے لیے آواز اٹھا سکے۔قوم پرست پارٹیوں کے طلبہ ونگ بڑے پیمانے پر بدعنوانی اور گراوٹ کا شکار ہو چکے ہیں اور طلبہ کے حقیقی مسائل کے لیے ان کے پاس کوئی پروگرام نہیں۔اسی طرح بنیاد پرست جماعتوں کے طلبہ ونگ ان نوجوانوں کو صرف دہشت گرد ہی بنا سکتے ہیں اور کچھ بھی نہیں۔اس صورتحال میں تمام تعلیمی اداروں کی کوکھ میں ایک طلبہ تحریک پنپ رہی ہے اور جنم لینے کے لیے بیتاب ہے۔حکمران کبھی سکیورٹی کے نام پر طلبہ میں خوف و ہراس پھیلا کر اور کبھی دہشت گردی کے ذریعے اس تحریک کو جنم لینے سے پہلے ہی کچل دینا چاہتے ہیں لیکن ایسا ممکن نہیں۔رینجرز کو تعلیمی اداروں میں وسیع اختیارات کا مقصد ہی یہ ہے کہ ایک ممکنہ طلبہ تحریک سے

نپٹنے کی تیاری کی جائے۔لیکن کہتے ہیں کہ کس کے روکے رُکا ہے سویرا۔ پاکستان میں آنے والے عرصے میں ایک بہت بڑی طلبہ تحریک ابھرے گی اور بنیادی ایشوز سے آغاز کرتے ہوئے سیاسی ایشوز کی جانب بڑھے گی۔اس پر مختلف سیاسی پارٹیوں کو مسلط کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور کی جاتی رہے گی۔اس پر دہشت گردوں کے بھی حملے ہوں گے اور رینجرز بھی جبر کریں گے۔لیکن اس کے باوجود اس تحریک کو ان تمام رکاوٹوں کو عبور کرنا ہوگا۔ضرورت اس امر کی ہے کہ طلبہ تعلیمی اداروں کی سکیورٹی اپنے کنٹرول میں لیں۔ بہت سے ایسے واقعات ہو چکے ہیں جن میں ریاستی ادارے اور پرائیویٹ سکیورٹی کمپنیاں تعلیمی اداروں کی حفاظت کرنے میں ناکام رہے ہیں۔طلبہ کو یونین کے مطالبے کو سنجیدگی سے لینے کی ضرورت ہے اور ان یونینوں کے ذریعے ادارے کی سکیورٹی کی ذمہ داری کے علاوہ فنڈز کی بھی نگرانی کرنی ہوگی۔حکومت نے تعلیمی اداروں کے بجٹ انتہائی کم کر دیے ہیں اور یہ ادارے طلبہ کی فیسوں سے ہی چل رہے ہیں۔طلبہ کو حق ہونا چاہیے کہ وہ جان سکیں کہ ان کی فیسوں کا پیسہ کہاں خرچ ہو رہا ہے۔اس کے علاوہ تعلیم کے معیار میں کمی روزگار کے حصول میں مشکلات کھڑی کرتی ہے جس کا سب سے زیادہ نقصان طالب علم کو ہوتا ہے۔اس لیے طلبہ یونینوں کے ذریعے ان تمام معاملات میں طلبہ کی مشاورت موجود ہونی چاہیے۔طلبہ یونین کو بھتہ خوری اور غنڈہ گردی کے باعث بدنام کیا گیا ہے لیکن آج اسے دوبارہ انقلابی بنیادوں پر استوار کرنے کی ضرورت ہے اور نام نہاد جمہوری حکومت سے تمام تعلیمی اداروں میں انتخابات کروانے کا مطالبہ کرنا چاہیے۔دہشت گردی کے حملوں کیخلاف احتجاجوں میں اس مطالبے کو زیادہ سنجیدگی سے طلبہ تک لیجانے کی ضرورت ہے۔

گزشتہ عرصے میں مختلف تعلیمی اداروں میں تحریکیں چلتی رہی ہیں جن میں قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد، پشاور یونیورسٹی اور دیگر شامل ہیں۔گلگت بلتستان سے لے کر کراچی تک طلبہ مختلف محاذوں پر لڑائی لڑ رہے ہیں اور یہ لڑائیاں انہیں منظّم بھی کر رہی ہیں۔ضرورت یہ ہے کہ ان تحریکوں کو تمام طلبہ کے عمومی مسائل کے گرد جوڑا جائے۔اس کے علاوہ ملک سے باہر چلنے والی طلبہ تحریکوں سے بھی جڑت بنانے اور ان کے تجربات سے سیکھنے کی ضرورت ہے۔اس وقت ہندوستان کے علاوہ جنوبی افریقہ میں طلبہ کی ایک بہت بڑی تحریک موجود ہے جو ملک بھر میں مفت تعلیم کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یورپ کے بیشتر ممالک میں طلبہ معاشی حملوں کیخلاف احتجاج کر رہے ہیں۔آنے والے دنوں میں یہاں بھی ایسی ہی تحریکیں ابھریں گی جنہیں درست مارکسی نظریات سے لیس کیڈر

ہی درست سمت دے سکتے ہیں۔

اس وقت پاکستان میں پانچ کروڑ نوجوان ایسے ہیں جن کی عمر 18 سے 29 سال کے درمیان ہے۔ پاکستان کے انقلاب میں ان نوجوانوں کا کلیدی کردار ہوگا۔ یہ ریاست انہیں کسی بھی صورت روزگار اور بہتر زندگی نہیں دے سکتی۔ ملک سے باہر جانے کی خواہش تو سب کی ہے لیکن اس میں مشکلات ہیں لیکن ساتھ ہی بیرونی ممالک میں بھی بیروزگاری بڑھتی جارہی ہے اور ان نوجوانوں کے پاس مستقبل میں روشنی کی امید کم ہوتی جارہی ہے۔ ان نوجوانوں کی اکثریت کسی سیاسی پارٹی میں نہیں اور نہ ہی انہیں سیاست میں دلچسپی ہے لیکن وقت اور حالات انہیں سیاست میں گھسیٹ کر لائیں گے۔ عرب انقلاب کا آغاز بھی ایک نوجوان کی خودسوزی سے ہوا تھا۔ اب مراکش میں ایک مچھلی فروش نوجوان کے حکومتی اہلکاروں کے ہاتھوں قتل نے ایک نئی تحریک کا آغاز کر دیا ہے۔ ہندوستان میں کنہیا کمار کی گرفتاری نے تحریک کو بھڑکا دیا۔ یہاں بھی کوئی ایک واقعہ اس بارود کو آگ لگا سکتا ہے۔ یہ آگ ایک دفعہ بھڑک اٹھی تو حکمرانوں کے ایوانوں اور اس ظالم نظام کو جلا کر راکھ کر دے گی۔

جمود یا تحریک؟

کچھ قنوطیت پسند اس تمام کیفیت کو جمود کا نام دے رہے ہیں اور آنے والے عرصے میں کسی تحریک کے تناظر سے انکاری ہیں۔ دراصل وہ آنے والی تحریک سے خوفزدہ ہو چکے ہیں اور اس سے فرار کا رستہ اختیار کر رہے ہیں۔ پاکستان میں ایک بہت بڑی تحریک کا ابھرنا ناگزیر ہے لیکن اس کے لیے وقت اور تاریخ کا اعلان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سماج کے کسی بھی حصے سے ابھر سکتی ہے خواہ کسان ہوں، طلبہ ہوں یا مزدور۔ روس کے انقلاب کا آغاز خواتین کے احتجاجی مظاہروں سے ہوا تھا۔ سماج کے کسی ایک حصے سے شروع ہونے والی تحریک بہت تیزی سے دوسرے حصوں کو اپنی لپیٹ میں لے گی۔ معاشی محاذ سے آغاز کرنے والی تحریکیں سیاسی میدان کی جانب بڑھتی ہیں اور اگر کوئی پارٹی انہیں رستہ نہ دے تو نئی پارٹیاں بنتی ہیں۔ یہ سماج کے بنیادی قوانین ہیں۔ پاکستان میں بھی نئی سیاسی پارٹیوں کا بہت بڑا خلا موجود ہے۔ اس قسم کے عوامل ہم دنیا کے ہر حصے میں دیکھ رہے ہیں۔ یہ پارٹیاں دائیں جانب بھی بنیں گی اور بائیں جانب بھی اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ سماج میں مادی بنیادیں حاصل کریں گی۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ ایک دفعہ کوئی نئی پارٹی ابھری ہے اور سماج کے کسی

ایک حصے کو متوجہ کیا ہے تو وہ ابدی طور پر موجود رہے گی۔ اگر وہ حالات کے مطابق پروگرام کو آگے نہیں بڑھاتی تو جتنی تیزی سے ابھری ہے اس سے زیادہ تیزی سے ختم بھی ہوسکتی ہے۔ اسی طرح بائیں بازو کا رجحان رکھنے والی پارٹیوں پر ابتدا میں اصلاح پسند قیادتیں حاوی ہوسکتی ہیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کی جگہ زیادہ انقلابی اور ٹھوس نظریات رکھنے والی قیادتیں لے سکتی ہیں۔ یہ سب ایک زندہ سماج میں ایک زندہ عمل ہے جو اپنے تمام تر تضادات کے ساتھ جاری رہے گا اور لاکھوں افراد کی اس میں شرکت اس کو مہمیز دے گی۔ ایسے میں یہ سماج موجودہ کیفیت سے نکل کر تیزی سے ایک انقلابی کیفیت کی جانب بھی بڑھ سکتا ہے۔ لیکن انقلابی کیفیت میں رد انقلابی قوتوں کو بھی اپنے وار کرنے کے متواتر مواقع ملیں گے۔ جہاں اس ملک میں محنت کش طبقہ بڑی تعداد میں موجود ہے وہاں سماج سے پچھڑی ہوئی پسماندہ پرتیں بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں جو ان رجعتی قوتوں کے لیے خام مال مہیا کریں گی۔ انقلاب اور رد انقلاب کی یہی کشمکش اور تضاد ایک نئے سماج کے جنم کا باعث بنے گا۔ اینگلز نے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ انسانیت کے پاس آگے بڑھنے کے لیے دو ہی راستے ہیں۔ سوشلزم یا بربریت۔ دہشت گرد حملوں اور ریاستی جبر کی کاروائیوں میں ہم اس بربریت کا ننگا ناچ دیکھ رہے ہیں۔ آنے والے حالات اس میں اضافہ کریں گے اور اس کے لیے زیادہ خونخوار قوتوں کو پروان چڑھایا جائیگا۔ اس خطے میں انسانی سماج کے زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی کلید یہاں کے محنت کش طبقے کے پاس ہے۔ اس طبقے کی قیادت اگر ایک ایسی انقلابی پارٹی کے پاس آتی ہے جو مارکسی نظریات سے لیس ہوکر منظّم تیاری کے ساتھ موجود ہے تو انسانیت کے روشن مستقبل کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ انقلابی سوشلزم کے ٹھوس نظریات پر مبنی کیڈرز کی ایک ایسی تنظیم بنائی جائے جو آنے والے دور کے طوفانی واقعات سے گھبرا کر منہ موڑنے کی بجائے اس کا مقابلہ کرنے کی طاقت رکھتی ہو۔ ان کیڈرز کی تعمیر کا کام مشقت طلب اور صبر آزما ہے۔ پیٹی بورژوا جلد بازی کا شکار ہوکر ہر کسی کے ماتھے پر کیڈر کی مہر لگا کر یا مفاد پرست سیاست دانوں، بیوروکریٹوں اور رسہ گیروں کو جمع کر کے انقلابی دلپشوری سے کیتھارسس کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ پختہ اور جانباز کیڈرز کی تعمیر ہی واحد نسخہ کیمیا ہے۔ یہی کیڈرز ان تحریکوں میں مداخلت کر کے سوشلسٹ انقلاب کے فریضے کی ادائیگی کرسکیں گے جو یہاں سے غربت، محرومی، لاعلاجی اور جہالت کے اندھیرے ہمیشہ کے لیے ختم کردے گا۔